مسئلہ اسرائیل

مسجد اقصیٰ کی تاریخ 3

یہود کو زمینیں بیچنے کے ادوار 4

اسرائیل کا قومی ترانہ 6

قرآن وحدیث کی روشنی میں 7

احادیث مبارکہ 14

رسول کریم ﷺ سے یہود کا رویہ 15

میثاق مدینہ 15

غزوۂ بدر اور یہودی 15

بنی قینقاع کی شرارت 16

بنی نضیر کی ہٹ دھرمی 16

بنی قریظہ کی غداری 17

خیبر کے یہودی 18

دور خلافت راشدہ 19

یہود اور خلافتِ عثمانیہ 20

مسلم ممالک اور یہود کا رویہ 21

ہسپانیہ میں یہودی 21

مصر کے یہودی 22

آنحضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حملہ 22

اہل علم ودانش کی آراء 23

ایڈورڈ سعید 24

علامہ اقبال 23

قائد اعظم محمد علی جناح 23

ڈاکٹر ایلمر بلجر 24

ڈاکٹر فرید عباس 24

سید ابو الاعلیٰ مودودی 25

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ 28

ڈاکٹر محمد مشتاق 31

صیہونی تحریک اور مسلمانانِ پاک و ہند 33

یہود کا ہدف 38

ہیکل_ سلیمانی کی تاریخ اور اس کی تیسری مرتبہ اندرونی تعمیر کی تیاری 39

فلسطین سے محبت کی وجہ 41

فرہنگِ اصطلاحات 43

اختتامیہ 49

مسجد اقصیٰ کی تاریخ[1]

مصریوں کی غلامی سے رہائی کے بعد جب صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے باقاعدہ شریعت عطا کی گئی تو ساتھ ہی حضرت موسیٰ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ وہ بدنی اور مالی عبادت کی مختلف رسوم ادا کرنے کے لیے خیمے کی شکل میں بنی اسرائیل کے لیے ایک عبادت گاہ بنائیں۔ اس خیمے کی بناوٹ، اس کے ساز و سامان اور اس میں ادا کی جانے والی رسوم کی پوری تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھائی۔ اتورات میں اس خیمے کا ذکر "خیمہ اجتماع"، "مقدس"، "مسکن" اور "شہادت کا خیمہ" کے مختلف ناموں سے کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ خاص وضع کا ایک صندوق بنا کر اس میں تورات کی الواح کو محفوظ کریں اور اسے "خیمہ اجتماع" میں ایک مخصوص مقام پر مستقل طور پر رکھ دیں۔

حضرت داؤد نے اس مقصد کے لیے ارنان یبوسی نامی شخص سے اس کا کوہ موریا پر واقع کھلیان خریدا اور تعمیر کے لیے ابتدائی تیاریاں شروع کر دیں۔ تاہم اپنی حیات میں وہ اس مرکز عبادت کو تعمیر نہ کر سکے۔ حضرت سلیمان نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے دور حکومت میں مقررہ جگہ پر ایک شان دار عبادت گاہ تعمیر کرائی جو تاریخ میں "ہیکل سلیمانی[2] (Solomon's Temple) " کے نام سے معروف ہے۔ اس کی تعمیر 950 ق م میں مکمل ہوئی۔

بابل کے بادشاہ نبوکد نضر کو ان پر مسلط کیا جس نے 586 ق م میں یروشلم پر حملہ کر کے ہیکل کو جلا کر برباد کر دیا، اس کے تمام خزانے اور قیمتی ظروف لوٹ لیے، بنی اسرائیل کا قتل عام کیا اور انھیں اسیر بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ فارس کے بادشاہ خورس (Cyrus) نے بابل کو فتح کرنے کے بعد 538 ق م میں بنی اسرائیل کو واپس یروشلم جانے اور وہاں ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ ہیکل ثانی کی تعمیر، جس کو زربابلی ہیکل کا نام دیا گیا، 515 ق م میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک بالکل سادہ سی عبادت گاہ تھی جس کا تزیین و آرایش اور تعمیر کے معیار کے لحاظ سے سلیمانی ہیکل کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تھا۔

یہ عبادت گاہ تقریباً ساڑھے چار سو سال تک قائم رہی، لیکن اس عرصے میں وقتاً فوقتاً حملہ آوروں کے ہاتھوں بے حرمتی کا نشانہ بنتی رہی۔ 169 ق م میں یونانی بادشاہ انطوخیوس چہارم اپی فینس نے ہیکل پر قبضہ کر کے اس کے ساز و سامان اور خزانے کو لوٹ لیا اور اس میں زیوس (Zeus) دیوتا کے نام پر قربانی کا مذبح قائم کر کے سردار کاہن کو مجبور کیا کہ وہ اس پر ایک خنزیر کی قربانی کرے۔

اس کے رد عمل میں 'مکابیوں کی بغاوت' نے جنم لیا اور 165 ق م میں یہوداہ مکابی کی قیادت میں بنی اسرائیل حملہ آوروں کو بے دخل کر کے ہیکل کی بازیابی اور تطہیر میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی یاد میں یہودی اب تک حنوکہ (Hanukkah) کا سالانہ تہوار مناتے ہیں۔

63 ق م میں یونانیوں کی جگہ جنرل پومپی کی قیادت میں رومی فوج نے فلسطین پر قبضہ کیا تو اس موقع پر زربابلی ہیکل کا ایک بڑا حصہ تباہی کی نذر ہو گیا۔ یہودیہ کے بادشاہ عظیم ہیرودیس نے، جس کا زمانہ حکومت 37 ق م سے 4 عیسوی تک ہے، زربابلی ہیکل کی تعمیر نو کرتے ہوئے احاطہ ہیکل یعنی اس کے گرد چار دیواری کو وسیع تر کر دیا، اور زمین سے اس کی اونچائی مزید بلند کر دی۔ یہ تعمیر 19 ق م میں شروع ہو کر 46 سال تک جاری رہی۔

فلسطین کی تباہی اور فلسطین سے یہودیوں کی بے دخلی دوسری مرتبہ 70 عیسوی میں وقوع پذیر ہوئی۔ جب رومی جنرل طیطس (Titus) نے 70ء میں یروشلم پر حملہ کر کے یہود کا قتل عام کیا اور ہیکل کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا اور یروشلم میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تاہم بعد کے ادوار میں یہ پابندی نرم کر کے یہودیوں کو مخصوص مواقع پر یروشلم میں آنے اور ہیکل کے کھنڈرات کی زیارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہیکل کی اس دوسری تباہی میں اس کی صرف مغربی دیوار محفوظ رہ گئی تھی جو رفتہ رفتہ یہودیوں کا مقام اجتماع اور ان کی گریہ وزاری کا مرکز بن گئی اور اس بنا پر "دیوار گریہ (Wailing Wall) " کہلانے لگی۔

---

[1] آصف محمود | ترکش | روزنامہ 92 نیوز منگل 29 دسمبر 2020ء

[2] جسے The First Temple بھی کہا جاتا ہے | www.jewishvirtuallibrary.org | Jewish Virtual Library

136ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یروشلم کو دوبارہ آباد کر کے اس کا نام 'Aelia Capitolina' رکھا اور ہیکل کی جگہ رومی دیوتا 'Jupiter' کے نام پر ایک عالی شان معبد تعمیر کرا دیا۔

چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کے روم کا سرکاری مذہب بن جانے کے بعد 336ء میں قسطنطین اعظم نے اس معبد کی جگہ کلیسائے نشور (Church of the Holy Sepulchre) تعمیر کرا دیا۔ 638ء میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کیا تو اس موقع پر امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کی معیت میں مسجد اقصیٰ میں آئے۔ اس وقت ہیکل کے پتھر (صخرہ بیت المقدس) کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا۔ سیدنا عمر نے صحابہ کے ساتھ مل کر اس کو صاف کیا اور احاطہ ہیکل کے اندر جنوبی جانب میں نماز پڑھنے کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی۔ بعد میں اس جگہ پر لکڑی کی ایک مستطیل مسجد تعمیر کی گئی۔ 688ء میں اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے صخرہ بیت المقدس کے اوپر ایک شان دار گنبد تعمیر کرا دیا جو 'قبۃ الصخرہ (Dome of the Rock)' کے نام سے معروف ہے۔ اسی نے لکڑی کی مذکورہ سادہ مسجد کی تعمیر نو کر کے اس کے رقبے کو مزید وسیع کر دیا۔ اسلامی لٹریچر میں "مسجد اقصیٰ" سے مراد یہی مسجد ہے۔

1078ء میں جب سلجوقی ترکوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو ان کے 20 سالہ دور حکومت میں یورپ اور پوری دنیا سے آنے والے مسیحی زائرین کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کیا گیا اور ان کے مقامات مقدسہ کی زیارت کے معمولات میں رکاوٹ ڈالی گئی۔ اس کے رد عمل میں 1096ء میں مغربی یورپ میں غیظ و غضب کی ایک لہر اٹھی جس نے صلیبی جنگوں کا روپ دھار لیا۔ پوپ اربن دوم کے حکم پر عیسائی جنگجوؤں کا ایک لشکر یروشلم پر قبضے کے لیے روانہ ہوا جس نے 1099ء میں یروشلم پر قبضہ کر کے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ مسیحی فاتحین نے قبۃ الصخرہ کو کلیسا میں تبدیل کر کے اس کے کلس پر سونے کی ایک بڑی صلیب نصب کر دی، جبکہ قبہ کے اندر مسیحی بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریں آویزاں کر دی گئیں۔ صخرہ کے اوپر ایک قربان گاہ بنا دی گئی جسے انھوں نے 'Templum Domini' جبکہ مسجد اقصیٰ کو 'Templum Solomonis' کا نام دے دیا۔

88 سال کے بعد 1187ء میں مسلمان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں دوبارہ یروشلم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور مسجد اقصیٰ کو مسجد کی حیثیت سے بحال کر کے قبۃ الصخرہ سے صلیب اتار دی گئی۔ اہل حلب کا خاص طور پر بنایا ہوا منبر مسجد میں نصب کرایا۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل مشرقی یروشلم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں مسجد اقصیٰ واقع ہے اور مسجد کو اسرائیلی فوج نے اپنے کنٹرول میں لے لیا، تاہم اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان نے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر احاطہ مقدسہ کی چابیاں اردن کے حکمران ہاشمی خاندان کے سپرد کر دیں۔ اس وقت سے اس احاطے اور اس سے ملحق بعض عمارتوں کا کنٹرول یروشلم کے مسلم وقف کے پاس ہے جو اس کے جملہ امور کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔

21 اگست 1969ء کو ایک آسٹریلوی یہودی ڈینس مائیکل روحان نے قبلۂ اول کو آگ لگا دی جس سے مسجد اقصیٰ تین گھنٹے تک آگ کی لپیٹ میں رہی اور جنوب مشرقی جانب عین قبلہ کی طرف کا بڑا حصہ گر پڑا۔ محراب میں موجود منبر بھی نذر آتش ہو گیا جسے صلاح الدین ایوبی نے فتح بیت المقدس کے بعد نصب کیا تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی یہودیوں کو گاؤں کے گاؤں اونے پونے داموں بیچنے کی غلطی اپنی جگہ، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہودیوں نے عربوں سے زمینیں خرید کر یہاں اسرائیل قائم کیا تھا۔ یہ واردات زمینیں خرید کر نہیں، زمینیں ہتھیا کر کی گئی۔ معاملے کی درست تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ چیزوں کی ترتیب ٹھیک رکھی جائے۔

یہود کو زمینیں بیچنے کے ادوار:

پہلا دور 1882 سے 1908 تک ہے اور دوسرا دور 1908 سے 1914 تک ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں ادوار کے اختتام پر یہودیوں کے پاس فلسطین کی صرف دو اعشاریہ چھ فیصد زمین تھی .

ان دو ادوار میں بیچی گئی زمینوں کی غلطی اپنی جگہ اور یہی غلطی یہودی ریاست کی تشکیل کے عوامل میں سے ایک عامل ہے لیکن اصل واردات اس کے بعد ہوئی جب برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور ایڈمنڈ ایلن بے نے کہا: ''اب صلیبی جنگیں اپنے اختتام کو پہنچیں''۔

عربوں کو برطانیہ نے اس وعدے پر ساتھ ملایا تھا کہ ان علاقوں میں عربوں کی حکومتیں بنیں گی۔ شریف حسین سے ایک تحریری وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن ایک وعدہ یہودیوں سے بھی کیا جا چکا تھا کہ فلسطین میں ان کا قومی وطن قائم کیا جائے گا۔ جب اس وعدے کی تکمیل کے وقت اخلاقی سوال اٹھے اور مقامی اضطراب بڑھا تو اس کا جواب لارڈ بالفور

نے اپنی ڈائری میں یوں دیا: ”ہمیں فلسطین سے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ صیہونیت ہمارے لیے عربوں کی خواہشات سے زیادہ اہم ہے“۔

چنانچہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی مہم کو عملی شکل دینے کی شروعات یہاں سے ہوئیں۔ نپولین وہ پہلا حکمران تھا جس نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری اور ریاست کے قیام کی تجویز دی۔

لیگ آف نیشنز نے فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دے دیا اور برطانیہ کو ہدایت کی کہ نہ صرف فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کی جائیں بلکہ صیہونی تنظیم کو باقاعدہ ریاستی نظم ونسق میں شامل کیا جائے۔

چنانچہ برطانیہ نے فلسطین میں جو پہلا کمشنر تعینات کیا تھا وہ یہودی تھا اور اس کا نام ہربرٹ سیموئل تھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ زراعت اور تعلیم کے شعبے یہودیوں کے حوالے کر دیے۔ دنیا بھر سے یہودیوں کو بلا کر فلسطین میں آباد کیا جانے لگا۔ انہیں زمین کاشت کرنے کے لیے قرضے دیے گئے اور رہائش کی مد میں الاؤنس جاری کیے۔ ساتھ ہی ان کے لیے وظیفے بھی مقرر کیے گئے۔ انہیں پیکج دیا گیا کہ جتنی فصل وہ تیار کریں گی اس کی قیمت کے ساتھ اتنا ہی انعام پائیں گے۔

دوسری طرف عربوں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے گئے۔ بقایاجات کی مد میں ان کی زمینیں ضبط کرنا شروع کر دیں۔ ضبط کردہ یہ زمینیں یہودیوں میں مفت تقسیم کی جانے لگیں۔

یروشلم کے مضافات سے آٹھ ہزار عرب کاشتکاروں کو 50 ہزار ایکڑ زمین سے بے دخل کر دیا گیا اور بدلے میں انہیں صرف تین پاؤنڈ دس شیلنگ کا معاوضہ ادا کیا گیا۔ غور فرمایئے تین پاؤنڈ دے کر پچاس ہزار ایکڑ زمین پر قبضہ۔

چنانچہ زمینیں بیچنے کے باوجود عالم یہ تھا کہ 1914 میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد جو صرف 70 ہزار تھی، 1939 تک بڑھ کر ساڑھے چار لاکھ تک جا پہنچی۔ یہودی جتھے فلسطین میں آنے لگے۔ وہ مسلح تھے۔ انہیں ہر قسم کا اسلحہ رکھنے کی آزادی تھی۔ کمشنر کی جانب سے انہیں نہ صرف اسلحہ کے لائسنس دیے گئے بلکہ اسلحہ بھی فراہم کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے البتہ قانون مختلف تھا۔ وہ اسلحہ نہیں رکھ سکتے تھے۔

حیفہ میں عرب کسانوں کو اسلحہ رکھنے کے جرم میں سزائے موت تک دی گئی۔ خنجر تک رکھنے پر پابندی تھی۔ کسانوں سے زرعی آلات برآمد کر کے کہا گیا یہ خنجر ہیں یا خنجر سے مشابہت رکھتے ہیں اور اس جرم میں انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا اور زمینیں ضبط کی گئیں۔ درانتی رکھنے کے جرم میں زمینیں ضبط کی گئی اور سزائیں سنائی گئیں یہ بھی خنجر ہی ہے .

جب مسئلہ فلسطین کو 1947 میں اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا تو اس ساری واردات کے باوجود عالم یہ تھا کہ فلسطین کی زمین کا صرف 6 اعشاریہ 5 فیصد (چھ اعشاریہ پانچ) رقبہ یہودیوں کے قبضے میں تھا۔ لیکن اقوام متحدہ نے مگر صریحاً ناانصافی کرتے ہوئے یہودیوں کو فلسطین کا 55 فیصد علاقہ دے دیا جب کہ ان کی آبادی نئے آبادکاروں کے طوفان کے باوجود 33 فیصد تھی۔ عرب اس وقت بھی 66 فیصد تھے لیکن ان کے حصے میں 45 فیصد علاقہ آیا۔ اقلیت کو زیادہ علاقہ مل گیا اور اکثریت کو کم۔ یہ اقوام متحدہ کا انصاف تھا۔

نومبر 1947 کو تقسیم کا یہ فارمولا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس کی مخالفت میں سب سے توانا آواز اس ملک کے وزیر خارجہ کی تھی جس کو قائم ہوئے صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ یہ پاکستان تھا۔ اس منصوبے کی منظوری کے لیے کم از کم درکار ووٹ 33 تھے۔ لیکن ملنے والے ووٹوں کی تعداد 30 تھی۔ چنانچہ ہیٹی، فلپائن اور لائبیریا کو ڈرا دھمکا کر یہ تین ووٹ لیے گئے اور تعداد پوری کی گئی۔ امریکہ کے پہلے سیکرٹری دفاع جیمز فورسٹل نے اس زمانے کے واقعات پر ڈائری لکھی جو The Forrestal Diaries کے نام سے نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون میں چھپتی رہی۔ اسے سنسر بھی کیا گیا اور بعد میں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا سنسر شدہ ایڈیشن آیا جس میں وہ لکھتے ہیں: ”اقوام متحدہ میں دوسری اقوام کو دباؤ میں لانے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ قریب قریب شرمناک تھے“۔ انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ ایس ویلس نے بھی اعتراف کیا کہ وائٹ ہاؤس کے براہ راست حکم پر یہ دباؤ استعمال کیا گیا۔ یوں اسرائیل قائم ہوا۔ زمینیں خرید کر نہیں، ہتھیا کر۔ اور یہ سلسلہ ابھی تھما نہیں، جاری ہے

اسرائیل کا قومی ترانہ

مسئلہ اسرائیل سے بخوبی آگاہی کے لیے اسرائیل کا قومی ترانہ سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دنیا کا واحد قومی ترانہ اسرائیل کا ہے جس میں کھلے عام دہشت گردی اور سینوں میں نیزے گاڑھنے اور عام خون بہانے کو کامیابی قرار دیا گیا ھے

اسرائیلی قومی ترانے کا انگریزی اور اردو ترجمہ

	اردو ترجمہ
* The Israeli National Anthem *	
* As long as there is a Jewish soul * in the heart!	جب تک دل میں یہودی روح ہے
- * yearning forward, towards the east *	یہ تمنا کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھتا ہے
- * Our hope is not made yet *!	ہماری امید ابھی پوری نہیں ہوئی
- * A thousand years dream on our land *	اپنی زمین پر ایک ہزار سال کا خواب
- * The land of Zion and Jerusalem *	اپنے خوابوں کی دنیا یوروشلم
- * Let those who are our enemy shudder *	ہمارے دشمن یہ سن کے ٹھٹھر جائیں
- * Let all the inhabitants of (Egypt and Canaan *) tremble	مصر اور کنعان کے سب لوگ، لڑکھڑا جائیں
- * Let the inhabitants of Babylon shudder *	بیبولون (بغداد) کے لوگ ٹھٹھر جائیں
- * To loom over their skies, panic and terror from us *	ان کے آسمانوں پر ہمارا خوف اور دہشت چھائی رہے
- * When we plant our spears in their chests *!	جب ہم اپنے نیزے ان کی چھاتیوں میں گھاڑ دیں گے
- * And we see their blood being shed *	اور ہم ان کا خون بہتے ہوئے
* And their heads cut off *!	اور ان کے سر کٹے ہوئے دیکھیں
- * Then we will be God's chosen people where God willed *	تب ہم اللہ کے پسندیدہ بندے ہونگے جو چاھتا ہے

قرآن و حدیث کی روشنی میں

مسجدِ حرام کے قبلہ اول ہونے کا ذکر قرآن حکیم اور حدیث نبوی ﷺ دونوں میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ[3]

بے شک پہلا گھر جو مقرر کیا گیا لوگوں (کی عبادت) کے لیے یقیناً وہ مکہ میں ہے"

صحیح بخاری میں ارشاد نبوی ہے:

عَنْ اَبِى ذرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ أَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ أَوَّلَ؟ قَالَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ قُلْتُ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ ثُمَّ الْمَسْجِدُ الأَقْصَى قُلْتُ كَمْ كَانَ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ أَرْبَعُونَ ثُمَّ قَالَ حَيْثُمَا أَدْرَكَتْكَ الصَّلَاةُ فَصَلِّ وَالْأَرْضُ لَكَ مَسْجِدٌ[4]

"حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ اس روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر ہوئی؟ آپ ﷺ نے جواب دیا "مسجد حرام"۔ میں نے پوچھا اس کے بعد، آپ ﷺ نے فرمایا "مسجد اقصیٰ"۔ میں نے کہا ان دونوں کی تعمیر کے دوران کل کتنا وقفہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تمہیں جہاں نماز پڑھنا نصیب ہو، پڑھ لو، تمہارے لیے ساری زمین مسجد ہے"۔

نسائی شریف کی شرح میں امام السندی نے اس حدیث کی وضاحت میں تحریر کیا ہے کہ:

ليس المراد بناء ابراهيم للمسجد الحرام وبناء سليمان للمسجد الاقصى فان بينهما مدة طويلة بلا ريب بل المراد بناؤهما قبل هذين البنائين[5]

"اس سے مراد مسجد حرام کی وہ تعمیر نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے کی اور نہ مسجد اقصیٰ کی وہ تعمیر جو حضرت سلیمانؑ نے کی، ان تعمیرات کے درمیان تو بڑی طویل مدت ہے، بلکہ یہاں ان تعمیرات سے قبل کی تعمیرات کا ذکر ہے"۔

گویا انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی دونوں مساجد تعمیر کی گئیں اور اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ یہ دونوں مساجد ابتداء میں حضرت آدمؑ نے تعمیر فرمائیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

بَعَثَ اللهُ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَى آدَمَ وَحَوَّاءَ، فَقَالَ لَهُمَا: ابْنِيَا لِي بِنَاءً، فَخَطَّ لَهُمَا جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَجَعَلَ آدَمُ يَحْفِرُ وَحَوَّاءُ تَنْقِلُ حَتَّى أَجَابَهُ الْمَاءُ، نُودِيَ مِنْ تَحْتِهِ: حَسْبُكَ يَا آدَمُ فَلَمَّا بَنَيَاهُ أَوْحَى اللهُ تَعَالَى إِلَيْهِ أَنْ يَطُوفَ بِهِ، وَقِيلَ لَهُ: أَنْتَ أَوَّلُ النَّاسِ، وَهَذَا أَوَّلُ بَيْتٍ، ثُمَّ تَنَاسَخَتِ الْقُرُونُ حَتَّى حَجَّهُ نُوحٌ، ثُمَّ تَنَاسَخَتِ الْقُرُونُ حَتَّى رَفَعَ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنْهُ[6]

"اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو حضرت آدمؑ و بی بی حوا سلامؑ علیھا کی طرف بھیجا پھر ان دونوں سے کہا کہ میرے لیے ایک عمارت بناؤ اور حضرت جبرئیلؑ نے ان کے لیے عمارت کی حدود کا نقش قائم کر دیا۔ حضرت آدمؑ بنیادیں کھودنے لگے اور اماں حوا مٹی ہٹاتی رہیں یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ پکارا گیا کہ اے آدم! رک جاؤ۔ پھر جب ان دونوں نے عمارت کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ نے انہیں طواف کرنے کا حکم دیا اور ان سے کہا گیا کہ آپ پہلے انسان ہیں اور یہ پہلا گھر ہے (جو کہ لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے)۔ پھر کئی نسلیں گزر گئیں تو حضرت نوحؑ نے اس گھر کا حج کیا۔ پھر کئی نسلیں گزر گئیں تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کی بنیادوں کو دوبارہ اٹھایا"۔

---

[3] سورہ آل عمران:96

[4] صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ ووھبنا لداؤد سلیمان نعم العبد

[5] شرح سنن النسائی للسندی، کتاب المساجد، باب ذکر ای مسجد وضع اول

[6] دلائل النبوۃ للبیھقی، باب ماجاء فی بناء الکعبۃ

ابن ہشام نے اپنی کتاب "التیجان" میں نقل کیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بیت اللہ کو تعمیر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف جائیں اور اس کی بنیاد رکھیں، تو انہوں نے جاکر اس کو تعمیر کیا۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر ان دونوں مقامات اور اِن سے ملحق سرزمین کے تقدس کا ذکر کیا گیا۔ مسجدِ حرام یا بیت اللہ کی حرمت یوں بیان کی گئی:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ [7]

"اللہ نے بنا دیا ہے اس کعبہ کو حرمت والا گھر اور لوگوں کی بقا کا ذریعہ"۔ بقول اقبال

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ ہے پاسباں ہمارا

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ(۹۶)فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ [8]

"بے شک پہلا گھر جو مقرر کیا گیا لوگوں (کی عبادت) کے لیے وہ یقیناً مکہ میں ہے برکت والا اور (وہ ذریعہ) ہدایت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں اور مقام ابراہیم (ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ) ہے اور جو کوئی بھی اس (گھر) میں داخل ہو گیا وہ آ گیا امن میں اور اللہ کے لیے لوگوں پر (فرض) ہے اس گھر کا حج کرنا جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اِس کی طرف راستہ (اختیار کرنے) کی اور جس کسی نے کفر (استطاعت کے باوجود حج نہیں) کیا تو بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہے"۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ [9]

"اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) جس مقام پر ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو"۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ [10]

"اور جب ہم نے ابراہیمؑ کو آباد کیا خانہ کعبہ کے پاس (اور اُنہیں حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھنا"۔

مسجدِ اقصیٰ سے ملحق سرزمین کی برکتوں کا ذکر اس طرح کیا گیا:

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِىْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ [11]

"(حضرت موسیٰؑ نے فرمایا) اے میری قوم کے لوگو! داخل ہو جاؤ اِس مقدس سرزمین (فلسطین) میں کہ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تم ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے"۔

---

[7] المائدۃ:97

[8] آل عمران:96-98

[99] البقرۃ:125

[10] الحج:26

[11] المائدۃ:21

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ[12]

"اور ہم نے مسخر کر دی تھی سلیمانؑ کے لیے تیز ہوا جو کہ چلتی تھی اُن کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کہ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے"۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا[13]

"اور ہم نے وارث بنا دیا اُن (بنی اسرائیل) کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اُس سرزمین (فلسطین) کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی"۔

اِس آیتِ مبارکہ میں بنی اسرائیل کی اُس عظیم سلطنت کی طرف اشارہ ہے جو ۱۰۴۰ ق م میں حضرت طالوت نے فلسطین اور اُس کے گردونواح میں قائم کی اور پھر وہ حضرت سلیمانؑ کے دور میں اپنے عروج کو پہنچی[14]

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ[15]

"اور ہم نے اُن (قومِ سبا) کے اور (فلسطین کی) اُن بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی (ایک دوسرے کے متصل) دیہات بنائے تھے جو سامنے نظر آتے تھے اور اُن میں آمدورفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا"۔

اِس آیتِ مبارکہ کے لفظ "القرٰی" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برکت صرف فلسطین کی بستی میں نہیں رکھی گئی بلکہ اُن تمام بستیوں میں رکھی گئی ہے جو کہ اِس سرزمین سے ملحق تھیں۔

مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ اور اِن سے ملحق مقامات کی یہی اہمیت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اِن دونوں مقامات کو دعوت توحید کا مرکز بنا دیا۔ جب اُن کی قوم اُن کی جان کی دشمن ہوئی تو اللہ نے انہیں بیت المقدس کی طرف ہجرت کروائی:

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ[16]

"اور ہم نے بچا لیا اُن (ابراہیمؑ) کو اور لوطؑ کو بھی ایک ایسی سرزمین (فلسطین) کی طرف کہ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی تمام جہان والوں کے لیے"

اِس آیتِ مبارکہ میں وارد لفظ "العالمین" سے واضح ہوتا ہے کہ سرزمینِ فلسطین کی برکات تمام جہان والوں کے لیے ہیں۔ یہودیوں کا یہ خیال باطل ہے کہ اِس سرزمین کی برکات صرف اُن ہی کے استفادے کے لیے ہیں۔ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے دعوتِ توحید کا ایک مرکز اِس سرزمین کو بنایا۔ اُن کے چھوٹے صاحبزادے حضرت اسحاقؑ اور پوتے حضرت یعقوبؑ کا مسکن یہی مقدس سرزمین تھی۔ اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مسجدِ حرام کے پاس شہر مکہ میں آباد فرمایا۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ[17]

---

[12] الانبیاء: 81

[13] الاعراف: 138

[14] برقی معلومات "مائیکروسافٹ انکارٹا: 2009"

[15] السباء: 18

[16] الانبیاء: 71

[17] ابراھیم: 38

"اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو لا بسایا ایک ایسی بنجر وادی میں جہاں کوئی کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس"

اِن مساجد کی ابتدائی تعمیر حوادثِ زمانہ کی وجہ سے منہدم ہوگئی۔ مسجدِ حرام کو اُس کی سابقہ بنیادوں پر حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ تعمیر کیا جن کا زمانہ 2000ق م سے 1800ق م کا ہے۔[18] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ[19]

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ بنیادیں اللہ کے گھر کی اور اُن کے گھر کی اور اُن کے ساتھ اسماعیلؑ"۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد تمام انبیاء کرام بشمول انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ مسجد حرام رہا، وہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے اور اس ہی کا حج کرتے تھے۔ مسجد اقصیٰ کو دوبارہ حضرت سلیمانؑ نے (جن کا زمانہ 961ق م سے 922ق م کا ہے)[20] نے تعمیر کیا اور اس کے بعد یہود نے اس مسجد کو قبلہ بنالیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب مسجد حرام یا بیت اللہ کی تعمیر مکمل کرلی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کی آواز لگائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ[21]

"اور (اے ابراہیمؑ) لوگوں میں حج کا اعلانِ عام کرو۔ وہ تیرے پاس آئیں گے پیدل اور دبلے اونٹوں پر اور دور دراز کے راستے سے وادیوں میں سے ہو کر آئیں گے"۔

اس آیت میں الناس کا ذکر ہے جس میں بنو اسرائیل اور ان کے تمام انبیاء بھی شامل ہیں۔ اب اگر بنو اسرائیل کے آباؤ اجداد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا تو ان کے بعد آنے والی نسلوں کا قبلہ تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بنو اسرائیل اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے دین پر تھے۔ جب حضرت یعقوبؑ کا قبلہ بیت اللہ تھا تو ان کی اولاد یعنی بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس کیسے ہو سکتا ہے؟ تورات سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ بنو اسرائیل کا قبلہ خانہ کعبہ ہی تھا۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ اپنے رسالہ "ذبیح کون؟" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ احضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا۔ چنانچہ توریت سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۱۸:۲۵ میں ہے:

"اس کی اولاد حویلہ سے شور تک مصر کے سامنے اس راستہ پر ہے جس سے آر سور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے بھائیوں کے "سامنے" بسے ہوئے تھے"۔

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہو گا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا"۔

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں کیوں کہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمام اولاد ماسوائے بنی اسماعیلؑ کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی۔ پس حضرت اسماعیلؑ ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سے قبلہ سمت میں تھی اور اس کو مان لینا بہت اقرب ہے کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد امامت کے وارث حضرت اسماعیلؑ ہوئے۔ قرآن مجید نے بھی اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کیے ہیں:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ[22]

---

[18] برقی معلومات: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا 2012

[19] البقرۃ:128

[20] برقی معلومات: مائیکروسافٹ انکارٹا 2009

[21] الحج:27

"اور جب کہ جانچا ابراہیمؑ کو اس کے خداوند نے چند باتوں میں سے (ان باتوں میں سب سے اہم اپنے بیٹے کی قربانی کا حکم تھا) پس ابراہیمؑ نے وہ پوری کر دکھائیں۔ فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا۔ پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا عہد ظالموں سے متعلق نہیں اور جب کہ ہم نے بنایا بیت اللہ کو لوگوں کا مرکز (یعنی مرجع جس کی طرف رک کر سکیں) اور امن کی جگہ اور حکم دیا کہ بناؤ مسکن ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو"۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کی قربانیوں کا قبلہ قرار دینے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو عظیم الشان قربان گاہ وہیں تھی"۔[23]

حضرت موسیٰؑ کو (جن کا دور ۱۴۴۰ ق م کا ہے)[24] اللہ نے حکم دیا:

وَاَوحَينَآ اِلٰى مُوسٰى وَاَخِيهِ اَن تَبَوَّاٰ لِقَومِكُمَا بِمِصرَ بُيُوتًا وَّاجعَلُوا بُيُوتَكُم قِبلَةً وَّاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ[25]

"اور ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرو اور قائم کرو نماز"۔

حضرت موسیٰؑ کے دور میں وہ قبلہ کون سا تھا جس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا؟ بلاشبہ وہ مسجد حرام ہی تھا۔ امام طبریؒ نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ:

"وَاجعَلُوا بُيُوتَكُم قِبلَةً کے حکم سے مراد کعبۃ ہے"[26]

حضرت موسیٰؑ کے دور ہی میں اللہ نے بنی اسرائیل کو خوش خبری دی کہ اگر وہ بیت المقدس میں آباد عمالقہ نامی قوم کے خلاف قتال کریں تو اللہ ان کو فتح دے گا:

يٰقَومِ ادخُلُوا الاَرضَ المُقَدَّسَةَ الَّتِى كَتَبَ اللّٰهُ لَكُم وَلَا تَرتَدُّوا عَلٰٓى اَدبَارِكُم فَتَنقَلِبُوا خٰسِرِينَ[27]

"(حضرت موسیٰؑ نے فرمایا) اے میری قوم کے لوگو! داخل ہو جاؤ اس مقدس سرزمین (فلسطین) میں کہ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تم ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے"۔

قوم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قتال کرنے سے صاف انکار کر دیا:

فَاذهَب اَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُونَ[28]

"(وہ بولے کہ موسیٰ!) تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے"۔

حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے اپنی قوم کی بزدلی پر ناراض ہو کر فریاد کی:

قَالَ رَبِّ اِنِّى لَآ اَملِكُ اِلَّا نَفسِى وَاَخِى فَافرُق بَينَنَا وَبَينَ القَومِ الفٰسِقِينَ[29]

"اے میرے رب! بے شک میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا، تو ہم میں اور اس نافرمان قوم میں جدائی کر دے"۔

اللہ نے جواب میں فرمایا:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيهِم اَربَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِى الاَرضِ ۗ فَلَا تَاسَ عَلَى القَومِ الفٰسِقِينَ[30]

---

[22] البقرۃ:124-125

[23] فراہی، حمید الدین، "ذبیح کون ہے؟"، اردو ترجمہ، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 1975: صفحہ 36

[24] برقی معلومات: انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا 2012

[25] یونس:87

[26] تفسیر طبری 15/174 عن ابن عباس (واجعلوا بیوتکم قبلۃ)، یعنی الکعبہ

[27] المائدۃ:21

[28] المائدۃ:24

[29] المائدۃ:25

"اللہ نے فرمایا کہ وہ سرزمین ان پر چالیس برس تک کے لیے حرام کر دی گئی، بھٹکتے پھریں گے زمین میں، پھر ان نافرمان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرنا"
۴۰ سال تک صحرا میں بھٹکنے کے دوران ایک نئی نسل صحرا میں پل کر جوان ہوئی۔ اس نسل پر فرعون کی غلامی کے اثرات نہیں تھے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

صحرا میں پرورش پانے والی اس نسل نے حضرت یوشعؑ بن نون کی قیادت میں جہاد کیا اور ارضِ مقدس پر فتح حاصل کی۔ یہ فتح عارضی ثابت ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد محکوم قوم یعنی عمالقہ دوبارہ غالب آگئی اور اس نے اسرائیلیوں کو ارضِ مقدس سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد حضرت طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل دوبارہ منظم ہوئے اور ۱۰۲۰ ق م میں انہوں نے ارضِ مقدس پر فتح حاصل کر کے مستحکم حکومت قائم کی[31]۔

۲۰ سال حضرت طالوت خلیفہ رہے، پھر ۴۰ سال حضرت داؤدؑ کی خلافت رہی اور اس کے بعد ۴۰ سال تک حضرت سلیمانؑ خلیفہ رہے۔ حضرت سلیمانؑ (جن کا زمانہ ۹۶۱ ق م سے ۹۲۲ ق م کا ہے) ارض مقدس میں ایک مسجد بنائی جسے ہیکل سلیمانی کہا جاتا ہے[32]۔ ارشاداتِ نبوی ہیں:

اِنَّ دَاوٗدَ ابۡتَدَا بِبِنَاءِ الۡبَیۡتِ الۡمَقۡدِسِ ثُمَّ اَوۡحَی اللّٰہُ اِلَیۡہِ اِنِّیۡ لَاَقۡضِیۡ بِنَائَہٗ عَلٰی یَدِ سُلَیۡمَانَ[33]

"حضرت داؤدؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں مکمل کرواؤں گا"۔

أَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ دَاوُدَ -صلى الله عليه وسلم- لَمَّا بَنَى بَيْتَ الْمَقْدِسِ سَأَلَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ خِلاَلاً ثَلاَثَةً سَأَلَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حُكْمًا يُصَادِفُ حُكْمَهُ فَأُوتِيَهُ وَسَأَلَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ مُلْكًا لاَ يَنْبَغِي لأَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ فَأُوتِيَهُ وَسَأَلَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حِينَ فَرَغَ مِنْ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ أَنْ لاَ يَأْتِيَهُ أَحَدٌ لاَ يَنْهَزُهُ إِلاَّ الصَّلاَةُ فِيهِ أَنْ يُخْرِجَهُ مِنْ خَطِيئَتِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ[34]

"حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ نے جب بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی۔ انہوں نے اللہ سے ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق مانگی جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ پس ان کی دعا پوری کی گئی۔ انہوں نے اللہ سے ایسی حکومت کا سوال کیا جو ان کے بعد کسی اور کو عطا نہ ہو۔ پس ان کا سوال پورا کیا گیا۔ جب وہ مسجد بنا کر فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جب بھی کوئی شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اس کی ماں نے اسے جنا ہو"۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنو اسرائیل کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ان کی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ شمالی ریاست اسرائیل کہلائی جسے ۷۰۰ ق م میں آشوریوں نے تباہ کر دیا[35] اور جنوبی ریاست یہودا کہلائی جس پر ۵۸۷ ق م میں بابل کے حکمران بخت نصر نے حملہ کیا[36]۔ اس نے بیت المقدس کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی، تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا، ہزارہا انسانوں کو قتل کیا، اور ایک لاکھ سے زائد کو قیدی بنا کر بابل لے گیا[37]۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴) فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا[38]

"اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔ پس جب پہلے (وعدے) کا وقت آیا تو ہم نے اپنے سخت لڑائی لڑنے والے بندے تم پر مسلط کر دیے اور وہ شہروں کے اندر پھیل گئے اور وہ وعدہ پورا ہو کر رہا"۔

---

[30] المائدۃ:26
[31] برقی معلومات: "مائیکروسافٹ انکارٹا 2009
[32] ایضاً
[33] فتح الباری لابن حجر، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا
[34] سنن النسائی، کتاب المساجد، باب فضل المسجد الاقصیٰ والصلاۃ فیہ
[35] برقی معلومات: 18 جون 2012، "Migrations of the Lost Tribes of Israel"
[36] برقی معلومات: مائیکروسافٹ انکارٹا 2009
[37] سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، "قصص القرآن" جلد 3، پروگریسو بکس، 4 بی، اردو بازار لاہور صفحہ 99
[38] بنی اسرائیل: 4-5

حضرت عزیرؑ جو اس وقت کے نبی تھے، شہر سے باہر تھے۔ انہوں نے واپس آ کر اجڑے ہوئے شہر کو دیکھا تو حیران ہوئے کہ جس شہر کے بارے میں مستقبل کی پیشین گوئیاں ان کے علم میں ہیں، یہ شہر دوبارہ کیسے آباد ہو گا؟ پھر اللہ کی حکم سے ان کو ایک سو (100) برس کی نیند دی گئی اور دوسری طرف ایران کے بادشاہ ذوالقرنین نے بابل پر حملہ کر کے اسرائیلیوں کو آزاد کرا دیا[39]۔ اب ان کے قافلے دوبارہ بیت المقدس آنا شروع ہوئے اور حضرت عزیرؑ کی تجدیدی مساعی کے ذریعہ ان میں پھر سے ایمان اور یقین کی شمعیں روشن ہوئیں اور سیرت و کردار کی اصلاح ہوئی۔ کچھ عرصہ یونانیوں کے ساتھ اسرائیلیوں کی معرکہ آرائی رہی اور آخر کار وہ ۱۷۵ ق م میں دوبارہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا نام تھا مکابی سلطنت[40]۔ اب انہوں نے دوبارہ ہیکل سلیمانی کے نام سے ایک مسجد تعمیر کر لی۔ اللہ نے اس کا ذکر یوں فرمایا:

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا[41]

"پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تمہیں کر دیا کثیر افرادی قوت والا"۔

حضرت مریم سلامٌ علیہا کی پرورش اسی ہیکلِ سلیمانی میں ہوئی اور پھر حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش بھی یہی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ یہ مقام عیسائیوں کے لیے بھی تقدس کا درجہ رکھتا ہے۔

یہودیوں کو حضرت عیسیٰؑ کو نا ماننے اور ان پر بہتان طرازی کی سزا اس طرح ملی کہ رومی جرنیل ٹائٹس نے ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ کر کے ایک بار پھر ہیکل کو شہید کر دیا۔ ایک لاکھ تنتیس ہزار یہودی مار دیے اور بقیہ کو بیت المقدس سے نکال کر ان کے شہر مقدس میں داخلہ پر پابندی لگا دی۔

یہ یہودیوں کا دور انتشار کہلاتا ہے جس میں یہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جانے پر مجبور ہو گئے۔

۳۱۳ء میں رومن ایمپائر نے بحیثیت مجموعی عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اب انہوں نے بیت المقدس کے مشرقی حصے میں جہاں حضرت مریم سلامٌ علیہا نے سکونت اختیار کی تھی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر لیں۔

۶۱۰ء میں نبی کریم ﷺ پر ظہورِ نبوت ہوا اور ۱۰ سال بعد یعنی ۶۲۰ء میں آپ ﷺ نے سفر معراج کے زمینی سفر کے دوران مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سفر کیا

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ[42]

"وہ (اللہ) پاک ہے جو لے گیا ایک ہی رات میں اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اس (بندے) کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائی۔ بے شک وہ سب سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے"۔

سفر معراج کے سے قبل آپ ﷺ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے تمام انبیاء کی ارواح سے ملاقات کی اور دو رکعات نماز میں ان کی امامت کی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ رَأَيْتُنِي فِي الْحِجْرِ وَقُرَيْشٌ تَسْأَلُنِي عَنْ مَسْرَايَ فَسَأَلَتْنِي عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ لَمْ أُثْبِتْهَا. فَكُرِبْتُ كُرْبَةً مَا كُرِبْتُ مِثْلَهُ قَطُّ قَالَ فَرَفَعَهُ اللَّهُ لِي أَنْظُرُ إِلَيْهِ مَا يَسْأَلُونِي عَنْ شَيْءٍ إِلاَّ أَنْبَأْتُهُمْ بِهِ وَقَدْ رَأَيْتُنِي فِي جَمَاعَةٍ مِنَ الأَنْبِيَاءِ فَإِذَا مُوسَى قَائِمٌ يُصَلِّي فَإِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ جَعْدٌ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوءَةَ وَإِذَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ - عَلَيْهِ السَّلاَمُ - قَائِمٌ يُصَلِّي أَقْرَبُ النَّاسِ بِهِ شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُودٍ الثَّقَفِيُّ وَإِذَا إِبْرَاهِيمُ - عَلَيْهِ السَّلاَمُ - قَائِمٌ يُصَلِّي أَشْبَهُ النَّاسِ بِهِ صَاحِبُكُمْ - يَعْنِي نَفْسَهُ - فَحَانَتِ الصَّلاَةُ فَأَمَمْتُهُمْ[43]

"میں نے اپنے آپ کو (شب معراج) انبیاء کی جماعت کے اندر پایا۔ میں نے دفعتاً دیکھا موسیٰؑ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا موسیٰؑ ایک مرد ہیں متوسط قد کے کسی قدر دبلے، گول بدن والے گویا کہ وہ قبیلہ شنوہ کے ایک مرد ہیں۔ پھر میری نظر عیسیٰؑ پر پڑی جو کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان سے بہت ملتے جلتے ہیں عروہ بن مسعود ثقفیؓ۔ پھر میں نے اچانک ابراہیمؑ کو نماز پڑھتے دیکھا جن سے تمہارے یہ دوست (یعنی خود نبی اکرم ﷺ) بہت مشابہ ہیں۔ پھر نماز کا وقت آ گیا اور میں نے سب کی امامت کی"۔

---

[39] برقی معلومات: نائیکر و سافٹ انکارٹا: 2009

[40] مودودی، ابوالاعلیٰ، "تفہیم القرآن" جلد دوم، ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، طبع پنجدہم، 1996، صفحہ 600

[41] النساء: 158

[42] بنی اسرائیل: 1

[43] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذکر المسیح ابن مریم والمسیح الدجال

اس سارے عمل کی حکمت یہ حقیقت واضح کرنا تھی کہ مسجدِ حرام کے ساتھ ساتھ اب مسجدِ اقصیٰ کے متولی بھی نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے امتی ہیں۔
ہجرت مدینہ کے بعد مسجد اقصیٰ کو قبلہ کا درجہ دیا گیا تھا اگرچہ اس کا حکم قرآن حکیم میں نہیں ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کو مسجدِ حرام سے شدید قلبی محبت تھی۔ مکی دور میں تو مسلمان نماز میں اس طرح رخ کرتے کہ مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ دونوں سامنے ہوتے۔ اسے استقبالِ قبلتین کہا جاتا ہے۔ مدینہ کے شمال میں مسجدِ اقصیٰ اور جنوب میں مسجد حرام ہے۔ اب اگر مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کیا جائے تو مسجدِ حرام کی طرف پشت ہو جاتی ہے۔ اس سے مقصود صحابہ کرامؓ کا امتحان لینا تھا کہ آیا وہ مسجدِ حرام سے اپنی محبت کو ترجیح دیتے ہیں یا اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے مسجدِ حرام کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنا لیتے ہیں[44]۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ[45]

"اور ہم نے نہیں مقرر کیا وہ قبلہ جس پر کہ (اے نبی ﷺ) آپ تھے مگر اس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون ہے جو رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اس کے برعکس جو اپنی ایڑھیوں کے بل رخ پھیر لیتا ہے اور یقیناً وہ بہت بھاری (حکم) تھا سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ نے ہدایت دی"۔

جب صحابہ کرامؓ کا امتحان اچھی طرح سے ہو گیا تو ہجرت کے ۱۶ ماہ بعد ۶۲۴ء میں تحویلِ قبلہ کا حکم ان الفاظ کے ساتھ وارد ہوا۔

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ[46]

"(اے نبی ﷺ) ہم دیکھ رہے ہیں آپ کے چہرے کا بار بار اٹھنا آسمان کی طرف۔ پس ہم پھیرے دیتے ہیں آپ کے چہرے کو اس قبلہ کی طرف کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں، تو پھیر لیجیے اپنے چہرے (رخ) کو مسجدِ حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں پر بھی ہو پس پھیر لو اپنے چہروں کو اس (مسجد حرام) کی طرف"۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں

لا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى وَ مَسْجِدِي[47]

تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کا (ثواب کی نیت سے) قصد کر کے سفر کرنا جائز نہیں ہے، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کا

من أهل بحجة أو عمرة من المسجد الأقصى الى المسجد الحرام غفر له ما تقدم من ذنبه و ما تأخر أو وجبت له الجنة

جس نے بھی مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام کے لیے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھا اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے یا اس کے لئے جنت واجب ہو جائے گی[48]

جس نے چار مساجد میں نماز پڑھی اس کے گناہ معاف کر دئے جائیں گے[49] امام السندی نے اس حدیث کی وضاحت میں تحریر کیا ہے کہ

چار مساجد سے مراد ہے مکہ اور مدینہ کی مساجد، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا[50]

---

[44] شفیع، مفتی محمد، "تفسیر معارف القرآن" جلد اول، ادارۃ المعارف کراچی، 1996، صفحہ 374

[45] البقرۃ:143

[46] البقرۃ:144

[47] صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینہ

[48] سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب فی المواقیت

[49] سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب ثواب من توضاء کما امر

[50] شرح سنن النسائی للسندی، کتاب الطھارۃ، باب ثواب من توضاء کما امر

رسول کریم ﷺ سے یہود کا رویہ

اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ظہور اقدس تک یہودی اقصائے عالم میں منتشر و آوارہ ہو چکے تھے۔ سود در سود، تجارت، کاروبار اور بردہ فروشی کی بدولت اپنی بستیاں جگہ جگہ آباد کر چکے تھے۔ ہر جگہ ان کا ہاتھ مقامی معیشیت تجارت کی گردن پر تھا۔ وہ اپنے مفادات کے لیے اوروں میں جہالت کو پروان چڑھاتے اور دوسروں کی بے بسی اور بے چارگی کا مذاق اڑا کر اپنی "دستارِ فضیلت" کا طرّہ بلند کرتے۔

حضور ﷺ کی بعثت کی اولین تائید مکہ کے مشہور راہب ورقہ بن نوفل نے کی تھی۔ اس نے اقرار کیا تھا کہ حضور ﷺ ہی وہ نبی ہیں جن کی آمد کا انتظار یہود و نصاریٰ دونوں کو تھا۔

حضور ﷺ کو یہود سے پہلا سابقہ ہجرت کے بعد پڑا۔ مدینہ کے نواح میں یہودیوں کی بستیاں قلعوں کی صورت آباد تھیں۔ تجارت، سود، طب اور فطری شر انگیزی نے انہیں مدینہ کی اجتماعی زندگی میں امتیازی حیثیت دے دی تھی۔ وہ مقامی لوگوں کو آپس میں لڑاتے، ان کے اختلافات کو ہوا دیتے اور اس باہمی جنگ و جدال سے اپنے ہاتھ رنگتے۔

میثاق مدینہ

جن دنوں آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں رونق افروز ہوئے، یہود کے تین قبیلے بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ اطرافِ مدینہ میں آباد تھے اور مضبوط قلعے اور برج بنا رکھے تھے۔ انصار کے دو مشہور قبائل اوس اور خزرج کے مابین جو آخری معرکہ (جنگِ بعاث) ہوا تھا، اس نے انصار کا زور توڑ دیا تھا۔ دونوں قبائل نے اسلام قبول کر کے آپس میں اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا کر لیا تھا۔ لیکن یہود ہمیشہ اس کوشش میں رہتے کہ انصار کے دونوں قبائل میں اتحاد نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر یہودی ریشہ دوانیاں کرتے رہتے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط فرمائے۔ یعنی حضور ﷺ نے انصار اور یہود کے درمیان ایک معاہدہ لکھوایا جسے فریقین نے قبول کیا۔ تاریخ میں یہ "میثاقِ مدینہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دنیا کا پہلا باقاعدہ تحریری وفاقی دستور تھا جو آنحضرت ﷺ کی قیادت میں مرتب و نافذ ہوا۔ یہ معاہدہ جمادی الثانی ایک ہجری / جنوری ۶۲۳ء میں ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

1. یہ سب لوگ ایک ہی قوم سمجھے جائیں گے۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم ہیں۔
2. جو کوئی معاہد قوم کے ساتھ جنگ کرے گا تو اس کے خلاف سب مل کر کام کریں گے۔ مسلمان اس کی نصرت کریں گے۔
3. معاہد اقوام کے باہمی تعلقات، باہمی خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کے ہوں گے، ضرر اور گناہ کے نہ ہوں گے۔
4. جنگ کے دنوں میں یہودی بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے اخراجات برداشت کریں گے۔
5. یہودیوں کی دوست اقوام کے حقوق یہودیوں کے برابر سمجھے جائیں گے۔
6. کوئی شخص اپنی معاہد قوم کے ساتھ مخالفانہ کاروائی نہ کرے گا۔
7. مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔
8. مدینہ کے اندر کشت و خوں تمام معاہد قوموں پر حرام ہو گا۔
9. زنہاری بھی معاہد قوموں جیسے سمجھے جائیں گے۔
10. اس معاہدے کی قوموں کے اندر اگر کوئی ایسی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا خوف ہو تو اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کا فیصلہ دونوں کو تسلیم کرنا ہو گا۔

"میثاقِ مدینہ" سے یہود اور مسلمانوں کی جمیعت سے ایک پر امن اور سلامتی والا معاشرہ وجود میں آیا۔

غزوۂ بدر اور یہودی

یہودی بظاہر اس معاہدے سے مطمئن نظر آرہے تھے، لیکن اندر سے ان کا خون کھول رہا تھا۔ غزوۂ بدر سے قبل کے واقعات اور مشرکین مکہ کے منصوبوں سے انہیں امید تھی کہ مسلمان زیادہ دیر تک نہیں جمیں گے۔ یہ جلد ختم ہو جائیں گے یا کمزور پڑ جائیں گے تو اسلام کی تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس کے لیے قریش مکہ کے ساتھ ان کا خفیہ نامہ وپیام جاری رہا۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے ساتھ بھی ان کی درپردہ سازباز تھی۔

لیکن "میثاق مدینہ" کے چار ماہ بعد ہی غزوۂ بدر نے اسلام کو ایک مستحکم "ریاست" بنا دیا تو یہودیوں کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب تک انہیں یہی توقع تھی کہ قریش مکہ کی جمیعت اسلام کو اور رسول ﷺ کو (نعوذ باللہ) ختم کر دے گی، لیکن جب غزوۂ بدر کا نتیجہ ان کی توقعات اور خواہشات کے برعکس نکلا تو ان کے دلوں پر غم کے بادل چھا گئے۔ آتش رقابت اور دلوں میں چھپی ہوئی دشمنی سامنے آئے بغیر نہ رہ سکی۔ انہوں نے تو اپنے اندازے کے مطابق مسلمانوں کو مدینہ میں چند روز کا مہمان سمجھ کر معاہدے پر وقتی طور پر دستخط کیے تھے مگر غزوۂ بدر کی بدولت مسلمان اب صرف ایک مذہب کے پیروکار ہی نہیں بلکہ ایک مستقل سیاسی و عسکری طاقت دکھائی دینے لگے اور "میثاقِ مدینہ" مسلمانوں کی تقویت کا باعث بنتا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہودیوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق میثاق کی خلاف ورزیاں شروع کر دیں۔

یہودی سردار کعب بن اشرف نے جب فتح بدر کی خبر سنی تو وہ چیخ اٹھا: "آج زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے"۔ وہ چند لوگوں کو ساتھ لے کر مکہ جا پہنچا اور انہیں جوش دلانے اور مسلمانوں سے شکست کا بدلہ لینے کی تلقین کرنے لگا۔ وہ ہیجان خیز مرثیے پڑھ کر قریش کو جوش دلانے اور انہیں انتقام پر اکسانے لگا۔

بنی قینقاع کی شرارت

آنحضور ﷺ بدر میں کفار مکہ سے برسرپیکار تھے کہ مدینہ کے یہودیوں نے آپ ﷺ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ جب مسلمان بدر میں فتح یاب ہوئے تو مدینہ کے یہودیوں کو اسلام کی "طاقت" سے خطرہ محسوس ہوا۔ اہل یہود میں سے بنی قینقاع سب سے بہادر اور لڑاکا قبیلہ تھا۔ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر سب سے پہلے اس قبیلے نے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے "میثاق مدینہ" کو توڑ ڈالا۔ مؤرخ ابن سعید لکھتے ہیں: "واقعہ بدر میں سب یہودیوں نے شورش کی اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا"۔

ایک اتفاقی حادثے نے حسد کی اس آگ کو مزید بھڑکایا۔ واقعہ یہ ہو کہ ایک انصاری عورت مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان پر گئی۔ یہودی نے اس کی بے حرمتی کی۔ اس سے غضب ناک ہو کر ایک غیرت مند مسلمان نے یہودی دکاندار کو قتل کر دیا، جس سے سارے مدینہ میں کشید گی پھیل گئی۔

آنحضور ﷺ جب غزوۂ بدر سے واپس مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کو حالات کا علم ہوا۔ آپ ﷺ نے اس فعل پر یہودیوں کی ملامت کی، جس پر بنو قینقاع بگڑ گئے اور بولے کہ ہم قریش نہیں، جب ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھلا دیں گے کہ لڑائی کسے کہتے ہیں۔ یہودیوں کی طرف سے یہ جواب نہ صرف معاہدہ توڑنے بلکہ اعلانِ جنگ کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ وسط شوال دو ہجری میں انحضور ﷺ نے یہودیوں کا محاصرہ کر لیا، جو پندرہ دن تک جاری رہا۔ بالآخر مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر بنو قینقاع قتل سے تو بچ گئے، مگر آنحضور ﷺ نے ان کی جلاوطنی کا حکم صادر فرمایا۔

بنی نضیر کی ہٹ دھرمی:

بنی کلاب کے دو آدمی مقتول ہوئے تو آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی کلاب ہمارا معاہد قبیلہ ہے، اس لیے ان کی دیت دینی ہو گی۔ یہودیوں کا قبیلہ بنی نضیر بھی چونکہ بنی کلاب کا حلیف تھا، اس لیے آنحضور ﷺ دیت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے علاوہ دوسرے صحابہؓ بھی تھے۔ بنی نضیر بظاہر آپ ﷺ سے بڑے اخلاق سے ملے اور حضور ﷺ کو ایک دیوار کے پاس بٹھایا، لیکن پوشیدہ طور پر ایک شخص کو بھاری پتھر دے کر چھت پر چڑھانے کا مشورہ کیا کہ جس وقت حضور ﷺ دیت کے متعلق گفتگو میں مصروف ہوں، اس وقت پتھر گرا کر آپ ﷺ کا کام تمام کر دیا جائے۔ سلام بن مشکم یہودی کو جب اس مشاورت کی خبر ہوئی تو اس نے اہل یہود سے کہا: "ایسا ہرگز نہ کرو خدا کی قسم اس کا رب اس کو خبر کر دے گا۔ نیز یہ بدعہدی ہے"۔

مگر اہل یہود نے اس بات کی پرواہ نہ کی اور عمرو بن حجاش کو پتھر گرانے کے لیے چھت پر چڑھا دیا۔ اس اثناء میں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آنحضور ﷺ کو یہودیوں کے سازشی مشورے سے مطلع کر دیا۔ آنحضور ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ تشریف لے آئے۔ حضور ﷺ وہاں سے اس طرح اٹھے تھے، جیسے کوئی کسی اہم ضرورت کے

تحت اٹھتا ہو۔ اس لیے صحابہؓ وہیں بیٹھے رہے۔ یہود کو جب حضور ﷺ کے چلے جانے کا علم ہوا تو بہت نادم ہوئے۔ کنانہ بن حویرا یہودی نے کہا: "تم کو معلوم نہیں کہ محمد ﷺ کیوں اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ خدا کی قسم، ان کو تمہاری غداری کا علم ہو گیا ہے۔ بخدا وہ اللہ کے رسول ہیں"۔

بہر حال جب آنحضرت ﷺ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو صحابہؓ آپ ﷺ کی تلاش میں مدینہ آئے حضور ﷺ نے صحابہؓ کو یہودیوں کی غداری سے مطلع فرمایا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ تم کو دس روز کی مہلت دی جاتی ہے، تم اطرافِ مدینہ سے نکل جاؤ ورنہ اس مدت کے بعد تمہارا جو شخص بھی پایا جائے گا، قتل کر دیا جائے گا۔

بنو نضیر کو یہ شرط منظور تھی اور دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جانے پر راضی تھے، مگر اس بنا پر انکار کر دیا کہ راس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے بنی قریظہ اور بنی غطفان کی حمایت اور اپنی طرف سے دو ہزار آدمی بھیج کر انہیں امداد کا یقین دلایا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے بنی نضیر کے انکار کے بعد حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ ربیع الاول ۴ ہجری / ستمبر ۶۲۵ء میں حضرت عبد اللہ بن مکتومؓ کو اپنے پیچھے مدینے کا عامل بنا کر آپ ﷺ بنی نضیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس غزوے میں اسلام کا پرچم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔ حضور ﷺ نے جاتے ہی بنی نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں کے خوف سے کوئی قبیلہ ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ایک اور عیاری کی وہ یہ کہ حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ تین آدمی ہمراہ لائیں جو ہمارے علماء سے مناظرہ کریں، اگر ہمارے علماء ایمان لے آئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ مگر پوشیدہ طور پر اپنے علماء کو ہدایت کی کہ وہ تین خنجر اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے جائیں، اور ملاقات کے موقع پر حضور ﷺ کو قتل کر دیں۔ اللہ کے حکم سے حضور ﷺ چونکہ ملاقات سے پہلے ہی بنی نضیر کی اس چالاکی اور عیاری سے باخبر ہو گئے تھے، اس لیے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

محاصرہ پندرہ روز تک جاری رہا۔ اس اثناء میں حضور ﷺ نے بنی نضیر کے باغوں اور درختوں کو کاٹنے اور جلانے حکم دیا۔ بالآخر بنی نضیر ذلیل ہو کر امن کے خواستگار ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرماتے ہوئے انہیں دس دن کی مہلت دی اور فرمایا کہ وہ سامان حرب کے علاوہ اپنے اہل و عیال اور جس قدر سامان اونٹوں پر اور سواریوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں، لے جائیں۔ بنی نضیر نے اس رعایت سے یہاں تک فائدہ اٹھایا کہ مکانوں کے دروازے اور چوکھٹ بھی اکھاڑ لیے اور جہاں تک بن پڑا، اونٹوں پر زیادہ سے زیادہ مال و اسباب لاد کر لے گئے۔ ان جلاوطن یہودیوں میں سے اکثر مدینہ سے دو سو میل شمال میں خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔

بنی قریظہ کی غداری

اب یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ رہ گیا تھا جو مدینے کے نواح میں آباد تھا اور اپنے دیگر قبائل کا انجام دیکھ کر کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ حضور ﷺ بھی اس کے عزائم سے بے خبر نہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان پر نگرانی کے لیے دو سو جاں باز مقرر کر رکھے تھے۔ دوسری جانب خیبر کے یہودیوں نے کفار مکہ سے مسلسل رابطہ رکھا اور انہیں مدینہ پر لشکر جرار کے ساتھ بڑے حملے پر آمادہ کرتے رہے۔ ان کی ناپاک مساعی کے نتیجے میں ۵ ہجری میں دس ہزار مسلح فوج مدینہ پر حملہ آور ہو گئی۔ آپ ﷺ نے شہر کے گرد خندق کھدوا دی۔ اس فوج نے بیس روز تک مدینے کا محاصرہ جاری رکھا۔ ایک دن کفار نے مسلمانوں پر پتھروں کی بارش کر دی۔ مسلمان ان کا جواب دینے میں مصروف تھے کہ یہود بنی قریظہ نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور اس قطعے پر حملہ کر دیا جہاں خواتین جمع تھیں، لیکن مسلمان خواتین نے زبردست جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں مار بھگایا۔ اس کے بعد کسی کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ یہود اور قریش مکہ کی آپس میں ٹھن گئی۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت فرمائی۔ ایک رات ایسا سرد طوفان آیا کہ قریش کے خیمے الٹ گئے اور وہ بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔ محاصرہ ختم ہو گیا۔

غزوۂ خندق سے واپسی پر حضور ﷺ نے بنو قریظہ کی بدعہدی اور غداری کی سزا دینے کے لیے حملے کا حکم دے دیا۔ حضور ﷺ نے ذی الحجہ ۵ ہجری میں حضرت عبد اللہ ابن مکتومؓ کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر فرما کر بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا جو ۲۵ دن تک جاری رہا۔ محاصرے کی طوالت اور شدت سے مجبور ہو کر بنو قریظہ اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسول کریم ﷺ جو حکم دیں، اسے منظور کر لیں۔ اس پر بنی اوس جو کہ بنو قریظہ سے حلیفانہ تعلقات رکھتے تھے، آنحضور ﷺ سے درخواست گزار ہوئے کہ جس طرح حضور ﷺ نے خزرج کی درخواست پر بنی نضیر سے معاملہ فرمایا تھا، اسی طرح ہماری درخواست پر بنو قریظہ سے معاملہ فرمائیں۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی سزا کا فیصلہ بنی اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ کریں، جن کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات بھی تھے اور جو ان کے حلیف قبیلہ اوس کے سردار ہونے کے سبب ان کے نزدیک بہت محترم تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ حضرت سعدؓ دیرینہ مراسم کی بنا پر ان کے ساتھ حضور ﷺ کی بہ نسبت زیادہ نرمی سے پیش آئیں گے۔ انحضور ﷺ نے بنی اوس کی درخواست منظور کرتے ہوئے یہ معاملہ ان کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ کے سپرد کر دیا۔

حضرت سعدؓ بن معاذ غزوۂ خندق میں شدید زخمی ہونے کے باعث مسجد نبوی کے پاس ایک خیمے میں مقیم تھے۔ انہیں یہود کی بد عہدی اور غداری کا سخت ملال تھا۔ انہوں نے بڑی بردباری کے ساتھ یہود سے پوچھا کہ "فیصلہ تمہاری کتاب تورات کے مطابق کیا جائے یا ہماری کتاب قرآن کے مطابق؟" انہوں نے اصرار کیا کہ ہماری کتاب کے مطابق فیصلہ صادر کیجیے۔ تورات کے باب "استثناء" میں کہا گیا ہے:

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تُو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھودیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں، سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر، اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں، سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی"۔

تورات کے اس حکم کے مطابق حضرت سعدؓ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ یہود کے لڑنے کے قابل تمام مردوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ کے فیصلے کو منشائے الٰہی کے مطابق سمجھا۔ حضرت سعدؓ اس فیصلے کے دوسرے دن ہی شہید ہو گئے، لیکن ان کے فیصلے کے مطابق تقریباً چھ سو یہودیوں کو قتل کر دیا گیا۔

خیبر کے یہودی

اب مدینہ کے گرد و نواح میں کوئی یہودی بستی باقی نہ رہی، لیکن خیبر کے یہودی غزوۂ خندق اور اس کے بعد کے واقعات سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ عرب خیبر یہودیوں کا گڑھ تسلیم ہوتا تھا، کیونکہ یہاں انہیں کافی قوت حاصل تھی۔ خیبر کی بستی متعدد قلعوں پر مشتمل تھی اور مدینے سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ یہود کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا، وہ یہ کہ اپنی دولت اور طاقت کا لالچ دے کر قریش کو ایک بار پھر آنحضور ﷺ کے خلاف اشتعال دلائیں اور فیصلہ کن جنگ لڑ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ انہوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے بنو غطفان کے چار ہزار نوجوانوں کو اس شرط پر آمادۂ جنگ کر لیا تھا کہ فتح مدینہ کے بعد وہ خیبر کی نصف پیداوار ان کو دے دیں گے۔ غرضیکہ یہودیوں نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے چاروں طرف سازش اور لالچ کا جال بچھایا ہوا تھا۔

آنحضور ﷺ خیبر کے یہودیوں کی ان تیاریوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ ﷺ نے قریش و یہود کے گٹھ جوڑ کو ناکام بنانے کے لیے قریش کے ساتھ یکم ذی القعدہ ۶ ہجری کو حدیبیہ کے مقام پر صلح نامہ لکھ لیا۔ حضور ﷺ حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ تشریف لائے۔ بقیہ ذوالحجہ اور چند روز محرم کے مدینہ میں گزارے۔ پھر اسی ماہ خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ یہودی لشکر کو مدینہ تک پہنچنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

آپ ﷺ اپنے ان صحابہ کے ہمراہ خیبر کی طرف روانہ ہوئے جنہوں نے صلح حدیبیہ میں حصہ لیا تھا۔ پرچم اسلام حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دوپٹے سے بنایا گیا تھا۔ لشکر اسلام کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے بیس خواتین بھی تھیں۔ خیبر کے یہودی اسلامی فوج کے پہنچنے سے پہلے خبردار ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے قلعے محفوظ کر لیے اور جنگ کی تیاری مکمل کر لی۔ یہاں ان کے سات قلعے تھے۔ پہلا قلعہ ناعم جب فتح ہو گیا تو سب یہودی مضبوط ترین قلعے قموص میں جمع ہو گئے۔ اس وقت حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ہراول دستے کا پرچم دے کر ان کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔ حضرت علیؓ نے قموص کے یہودی پہلوان مرحب کو قتل کر دیا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس طرح یہ مہم بھی کامیاب ہو گئی۔ قلعہ قموص کی فتح کے ساتھ ہی یہود کی کمر ٹوٹ گئی اور یکے بعد دیگر تمام قلعے فتح ہوتے چلے گئے۔

خیبر کی شکست کے بعد یہودی آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ہم آدھی بٹائی پر مسلمانوں کے لیے کھیتی باڑی کرنے پر تیار ہیں۔ اس کے بدلے ہمیں خیبر ہی میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ حضور ﷺ نے ان کے معاندانہ ماضی کے باوجود یہ درخواست منظور کر لی۔ یہود نے بظاہر پر امن شہریوں کے طور پر زندگی گزارنا شروع کر دی، لیکن درپردہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل میں مصروف رہے اور چھپ کر وار کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

فتح خیبر کے بعد قلعہ قموص کے سردار مرحب کی بھاوج اور سلام بن مشکم کی زوجہ زینب بنت الحرث نے حضور ﷺ اور چند صحابہؓ کی ضیافت کی۔ اس نے ایک دنبہ ذبح کرایا اور بھوننے سے پہلے اس نے حضور ﷺ سے پوچھا: "آپ کون سا حصہ پسند فرمائیں گے؟" حضور ﷺ نے جواب دیا "مجھے بازو کا گوشت (دستی) زیادہ پسند ہے" چنانچہ زینب نے پورے دنبے کا گوشت زہر آلود کیا اور خاص طور پر دستی میں زیادہ زہر ملایا۔ دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد آپ ﷺ نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا۔ ابھی نگلا نہ تھا کہ فرمایا "یہ ہڈی مجھ سے کہتی ہے کہ اسے زہر آلود کیا گیا ہے"۔ دیگر صحابہؓ نے آپ ﷺ کی پیروی کی، لیکن حضرت بشرؓ بن براء لقمہ نگل گئے تھے، اس لیے زہر خورانی سے شہید ہو گئے۔

اپنی آخری علالت میں حضور ﷺ نے یہ واقعہ یاد کرتے ہوئے فرمایا: "میرے پاس ام بشر آئی تھی اور میں نے اس سے کہا تھا، اے ام بشر! مجھے اس گوشت کی وجہ سے جو میں نے خیبر میں چبایا تھا، شدید درد لاحق ہے۔ اسی گوشت سے تیرا بھائی شہید ہوا تھا"۔ اس روایت کے مطابق حضور ﷺ کا وصال اسی زہر سے ہوا تھا۔

دور خلافت راشدہ

نبی اکرم ﷺ کے وصال کے پانچ سال بعد ۶۳۷ء میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کر لیا۔ یہ حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت تھا۔ عیسائیوں نے پر امن طور پر ایک معاہدے کے ذریعہ بیت المقدس مسلمانوں کے حوالے کیا۔ اس سے قبل مسلمانوں نے کئی روز سے اس شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا لیکن وہ شہر کو فتح کرنے سے قاصر تھے۔ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ ہماری کتابوں میں اس بادشاہ کے تمام اوصاف درج ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہو گا ہم تم میں ایسا بادشاہ نہیں پاتے۔ مسلمانوں نے یہ اوصاف دریافت کیے اوصاف جاننے کے بعد کہا کہ یہ تو ہمارے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کے اوصاف ہیں۔ قرآن مجید میں اس بات کا ذکر یوں ہے:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ[51]

"ان (صحابہؓ) کی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے"۔

حضرت عمرؓ خصوصی طور پر بیت المقدس تشریف لائے اور عیسائیوں نے ایک معاہدے کے تحت یہ شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ معاہدہ کرتے وقت عیسائوں نے مطالبہ کیا کہ یہودیوں کو اس شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارا دین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ البتہ معاہدے میں یہ طے ہوا کہ یہودی اس علاقہ میں آباد نہ ہو سکیں گے یعنی یہاں کوئی رہائشی، صنعتی یا زرعی اراضی یا عمارت نہیں خرید سکیں گے[52]۔

حضرت عمرؓ نے تو بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا، پھر عیسائیوں نے ہم سے لیا، پھر ہم نے دوبارہ عیسائیوں سے لیا، اور حضرت عمرؓ کے دور سے اب سے ایک صدی پہلے تک مسلمانوں کا کنٹرول رہا ہے۔

- حضرت عمرؓ نے ایک تبدیلی کی تھی کہ رومیوں کے زمانے میں ہیکل سلیمانی جو انبیاء کی عبادت گاہ تھی، اس پر نفرت سے کوڑے کا ڈھیر لگا دیا گیا تھا اور وہاں گندگی پھینکی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی صفائی کروائی، خود اپنی چادر بچھا کر صفائی شروع کی اور سارا کوڑا اٹھایا کہ یہ انبیاء کرامؑ کی عبادت گاہ رہی ہے اور مقدس جگہ ہے۔
- دوسرا تاریخی کام حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ صفائی کر چکنے کے بعد ساتھیوں نے کہا کہ یہاں نماز پڑھیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں! میں یہاں نماز نہیں پڑھوں گا، اس لیے کہ اگر میں نے ایک نماز یہاں پڑھ لی تو تم نے اس بہانے اس پر قبضہ کر لینا ہے، یہ ہماری عبادت گاہ نہیں ہے، یہ یہودیوں کی عبادت گاہ ہے، یہودیوں کی عبادت کا حق ہے، ہم الگ مسجد بنائیں گے، چنانچہ انہوں نے الگ مسجد بنائی۔
- اس کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ان کا یہ حق بحال کر دیا کہ آ کر عبادت کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کو اجازت دے دی، یہودیوں کی وہاں "دیوار گریہ" معروف ہے، نیم گری ہوئی، نیم ثابت، قدیمی آثار میں سے ہے۔ اس کے ساتھ چمٹ کر روتے ہیں، اپنے پرانے دور کو یاد کرتے اور دعائیں کرتے ہیں۔ جیسے ہم بیت اللہ میں ملتزم کے ساتھ چمٹ کر عبادت کرتے اور روتے ہیں۔

یہود کو حضرت عمرؓ نے عبادت کی اجازت دے دی لیکن یروشلم کے نظام کا کنٹرول مسلمانوں کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے سے خلافت عثمانیہ کے دور تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ مسلمانوں کے تمام ادوارِ حکومت میں یہودیوں نے اس پابندی کو ختم کرانے کی کوشش کی اور بعض موقع پر بھاری مالی امداد کی بھی پیشکش کی لیکن کوئی مسلمان حکمران اس پر تیار نہ ہوا۔

---

[51] الفتح:29

[52] گل، موشے (Gil,Moshe)، A History of Palestine، کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1997، صفحہ 634

یہود اور خلافتِ عثمانیہ

ہمارے ہاں خلافت کی ترتیب یہ ہے خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ، خلافت بنو عباس، پھر جب ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کر دیا تھا اور آخری عباسی خلیفہ کو قتل کر دیا تھا، پھر ہم بکھرے تھے اور مصر میں کچھ دن ہمارا فاطمی حکومت کے ذریعے تھوڑا سا اقتدار رہا۔ اس کے بعد عثمانی کھڑے ہو گئے، انہوں نے اسلامی ریاست قائم کی، وہی ریاست بعد میں خلافت عثمانیہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے، ان کا پہلا حکمران عثمان تھا، یہ سلطنت اس کے نام سے منسوب ہے نہ کہ حضرت عثمانؓ کے نام پر۔ سلطنت عثمانیہ نے خلافت کا ٹائٹل استعمال کیا اور اس کے بعد صدیوں حکومت کرتے رہے اور اہل اسلام کے متفق علیہ خلافت رہی ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس پر بھی اس کا کنٹرول تھا، خطبے میں ان کا نام پڑھا جاتا تھا، ان سے وفاداری کا اعلان ہوتا تھا۔ یہ الگ تاریخ ہے اہل اسلام کا خلافت عثمانیہ پر اعتماد و احترام اپنی جگہ پر۔

اس دوران فلسطین خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا، آج کے نقشے میں فلسطین اور اسرائیل دو الگ الگ ریاستیں دکھائی دیتی ہیں، یہ دونوں ملا کر اصل فلسطین تھا جو خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم نے وہاں جا کر آباد ہونا ہے اور اپنی آبادی بڑھا کر وہ ماحول پیدا کرنا ہے کہ ہم بیت المقدس کے معاملات میں دخیل ہو سکیں اور آہستہ آہستہ اس پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت ترکی کی خلافت عثمانیہ سے ان کی کوئی لڑائی نہیں تھی۔ ان کا وفد ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانیؒ کے پاس آیا جو اپنے وقت کے بہت باوقار حکمران اور عالمی شخصیات میں سے تھے۔ قسطنطنیہ میں خلیفہ کا ہیڈ کوارٹر "بابِ عالی" کہلاتا تھا۔ بابِ عالی کو تقریباً تین صدیاں دنیا میں وہی پوزیشن حاصل رہی ہے جو اس وقت امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس کو حاصل ہے کہ دنیا کے ہر معاملے میں دخل دینا اور کوئی معاملہ ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہونا اس کی پوزیشن رہی ہے۔ سلطان عبد الحمید ثانیؒ بڑے باحمیت حکمران تھے، انہوں نے اپنی یادداشتیں خود لکھی ہیں۔ ان کو بعد میں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، نظر بندی میں ان کا انتقال ہوا، نظر بندی کے دوران انہوں نے یادداشتیں لکھیں جو ترکی میں تھیں۔

خلافت عثمانیہ کا قانون فلسطین کے حوالے سے یہ تھا کہ فلسطین میں یہودی بیت المقدس میں اپنی عبادت گاہ میں آ کر عبادت کر سکتے ہیں، کچھ دن اجازت نامے کے ساتھ رہ سکتے ہیں، لیکن یہاں زمین نہیں خرید سکتے، مکان نہیں بنا سکتے، یہاں کاروبار نہیں کر سکتے، مستقل رہائش اختیار نہیں کر سکتے۔ سلطان عبد الحمید ثانیؒ سے یہودیوں کا وفد ملا، ہرتزل اس کا لیڈر تھا، اس نے سلطان سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم تھوڑی بہت تعداد میں فلسطین میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ آپ اس قانون میں لچک پیدا کر کے ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیں۔ سلطان عبد الحمید کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کا سارا منصوبہ میرے ذہن میں تھا کہ یہ وہاں کرنا کیا چاہ رہے ہیں، ان کا پروگرام کیا ہے، کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا۔

اگلے سال وہی وفد دوبارہ آیا اور اس بار پینترا بدلا۔ یہ بات آپ کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ دنیا میں سائنسدانوں کی اکثریت یہودیوں کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم انٹرنیشنل سائنس یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں، سارے سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کریں گے، سائنس کی ترقی کے لیے ہم بڑا منصوبہ رکھتے ہیں، آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ہمیں فلسطین میں جگہ دے دیں اور سہولیات فراہم کریں کہ ہم سائنس یونیورسٹی بنا سکیں۔ آپ کو بھی فائدہ ہو گا، ہمیں بھی فائدہ ہو گا۔ اور ہم آپ کی سپورٹ کے لیے تمام یہودی سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کر دیں گے۔ سلطان عبد الحمید نے کہا ٹھیک ہے، سائنس کی ترقی کی خاطر انٹرنیشنل سائنس یونیورسٹی کے لیے میں آپ کو جگہ بھی دوں گا، خرچہ بھی دوں گا، سپورٹ بھی کروں گا، پشت پناہی بھی کروں گا، لیکن اس شرط پر کہ وہ فلسطین میں نہیں ہو گی، فلسطین کے علاوہ دنیا کے جس خطے میں آپ بنانا چاہیں میں مکمل تعاون کروں گا۔ اس پر وہ نہیں آئے کہ نہیں! ہمیں جگہ فلسطین میں چاہیے۔

تیسرے سال پھر آئے اور اب ایک اور پیشکش کی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آغاز کا دور تھا، ہر چیز پر عروج کے بعد زوال کا دور ہوتا ہے۔ یہ خاصے مقروض ہو گئے تھے۔ یہود کی پیشکش یہ تھی کہ آپ کی سلطنت کے سارے خرچے ہم اٹھاتے ہیں، آپ کے قرضے ادا کریں گے، آپ فلسطین میں ہمیں مطلوبہ جگہ دے دیں۔ اب سلطان نے انہیں غصے سے نکال دیا اور کہا کہ آج کے بعد میں آپ سے ملاقات نہیں کروں گا اور مجھ سے آپ توقع نہ رکھیں کہ میں فلسطین میں آپ کو جگہ دوں گا۔

یہ تین سال مذاکرات ہوئے۔ یہ دور تھا ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان کا۔ اس کے بعد ہی سلطان عبد الحمید کے خلاف ترکی میں تحریک چلی اور پھر انہیں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی ہی میں خلیفہ نے یادداشتیں لکھیں اور نظر بندی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

مسلم ممالک اور یہود کا رویہ

یہود کو ان کی بد عہدی اور بد عملی کے باعث سر زمین عرب سے خارج کرنا تو ناگزیر ہو چکا تھا، مگر مسلمان اس سے اہل کتاب ہونے اور ذمی ہونے کی وجہ سے حسن سلوک ہی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ چنانچہ جہاں جہاں تک اسلامی سلطنت پھیلتی چلی گئی، وہ بھی آگے بڑھتے رہے۔ عربوں نے انہیں مصر، فلسطین، شام اور ایران کہیں سے بھی بے دخل نہ کیا۔ وہ بے خوف ہو کر کھیتی باڑی اور تجارت کرتے رہے۔ ان کے اسقف اعظم بابل، آرمینیا، ترکستان، ایران اور یمن میں اپنے اپنے علاقے کے یہودیوں کے لیے شہزادوں کی سی حیثیت رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان اسلامی ممالک میں ان کے احترام میں مسلمانوں کا اٹھ کر سر جھکانا ایک معمول بن گیا تھا۔ اسقف اعظم کا عہدہ ایک ہی خاندان کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا، اس لیے اسے مذہبی وقار و احترام کے ساتھ سیاسی مقام بھی حاصل تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں انہیں "عالی مرتبت" کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔

ہسپانیہ میں یہودی

طارق بن زیاد نے ۷۱۰ء میں اندلس فتح کیا تو وہاں یہودی مسلمانوں کے زیر سایہ پھلنے اور پھولنے لگے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کا عہد زریں تھا۔ ان کی مذہبی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ ظہور اسلام سے پہلے کے ہسپانوی حکمرانوں نے ان کی شرارتوں اور سازشوں کے باعث انہیں اس قدر کچل دیا تھا کہ انہیں ایک صدی تک سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے ایک پھر انہیں باعزت زندگی گزارنے کا موقع دے دیا۔ انہیں اعلیٰ سرکاری مناصب سونپے اور افواج میں بھی بھرتی کیا، یہاں تک کہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ انہیں سفارتیں بھی دی گئیں۔ وہ تاجر بھی تھے، زمیندار بھی اور صنعت کار بھی۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں ان کی جداگانہ بستیاں تھیں جن پر قلعے ہونے کا گمان ہوتا۔ انہیں اپنی بستیوں میں اپنے تمام معاملات میں آزادی اور خود مختاری حاصل تھی۔ ان کی سود خوری کی لعنت سے بھی مسلم حکومتیں کوئی تعرض نہ کرتی تھیں ان بستیوں میں ان کو اپنے مقدمات کے فیصلے خود کرنے، یہاں تک کہ اپنے مجرموں کو پھانسی دینے کا بھی اختیار حاصل تھا۔

ان تمام مراعات اور سہولتوں کے باوجود یہودیوں کی سرشت نہ بدلی۔ اپنے معاملات کو مخفی رکھنے کے لیے انہوں نے ایک قانون نافذ کیا جس کے تحت ان رازوں کے افشا کی سزا "موت" تھی۔ انہیں یورپ کے ہر شہر اور قصبے میں آمد و رفت اور تجارتی روابط بڑھانے کی اجازت تھی، لیکن وہ ان سہولتوں کو درپردہ اپنے آپ کو منظم کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے، یہاں تک کہ اندلس میں بیرونی تجارت مکمل طور پر ان کے قبضے میں آگئی۔ انہیں بابل، بغداد، اسکندریہ اور روم کے مذہبی مراکز کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ قرطبہ، غرناطہ، اشبیلہ اور طنجہ وغیرہ میں ان کے مذہبی سکول رائج ہو گئے جن میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب، موسیقی، ریاضی، نجوم، طب اور فلسفہ بھی پڑھایا جاتا تھا۔ ان سہولتوں کی وجہ سے ان میں بڑھتی ہوئی خود اعتمادی نے خود سری اور رعونت کی شکل اختیار کر لی۔ ہسپانیہ کے یہودی وزیر اعظم یوسف بن مجدلہ نے، جس کا باپ سموئیل حلیوی بھی وزیر اعظم رہ چکا تھا، تمام شاہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے، اور یہاں تک سرکشی کا مظاہرہ کیا کہ قرآن مجید کی بے حرمتی کر ڈالی۔ اس پر عربوں اور بربروں نے باہمی اختلافات دور کر کے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس بغاوت کو چونکہ ساری مسلم آبادی کی بھرپور حمایت حاصل تھی، اس لیے انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ انہوں نے وزیر اعظم کو پھانسی پر لٹکایا اور غرناطہ کے چار ہزار یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ ان کے گھر بار اور کاروبار کو تباہ برباد کر دیا گیا۔

۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء میں یوسف بن تاشفین نے الفانسو کو شکست دینے کے بعد اندلس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا خاتمہ کر کے ایک متحدہ و مستحکم سلطنت قائم کر دی۔ انہی دنوں ایک عالم دین نے یہودیوں کو یاد دلایا کہ ہجرت کے بعد تمہارے آباؤاجداد نے حضرت محمد ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم مزید پانچ سو سال تک مسیح کے نزول کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ اس وقت تک نہ آئے تو ہم اسلام قبول کریں گے۔ اس حساب سے انہیں ۱۱۰۷ء تک مشرف بہ اسلام ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین نے ان سے مطالبہ کیا کہ ہسپانیہ کے تمام یہودی فوراً اسلام قبول کر لیں۔ یہودی نہ مانے اور انہوں نے جزیہ دے کر رہنا پسند کیا۔

مرابطین کے بعد ہسپانیہ پر موحدین برسر اقتدار آئے تو انہوں نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو اختیار دیا کہ وہ مسلم ریاست میں آزادانہ اور دوسروں کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اسلام قبول کرنا ہو گا، ورنہ ریاست سے نکل جائیں۔ بہت سے یہودیوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا اور جو ایسا نہ کر سکے، وہ عیسائیوں کے ساتھ سپین چلے گئے۔ اس طرح مسلم سپین یہودیوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو گیا۔

شمالی سپین میں عیسائی برسر اقتدار تھے۔ وہاں یہودیوں کو عیسائیوں کے ساتھ مساوی حقوق ملے تو انہوں نے وہاں بھی اپنی ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع کر دیں۔ یہاں الفانسو کی حکومت تھی، جس نے یہودیوں کے خلاف سخت تادیبی کاروائی کی۔ اس وقت طلیطلہ میں ۷۲ ہزار یہودی آباد تھے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی کھل گئے۔ وزارتوں اور سفارتوں پر بھی فائز ہونے لگے۔ ۱۱۴۹ء میں الفانسو ہفتم کے یہودی وزیر نے طلیطلہ کے ایک انتہا پسند یہودی فرقے "قرأ" کو حکومت کی طاقت استعمال کر کے ملیامیٹ کر دیا۔ الفانسو دہم کا زمانہ آیا تو اس نے یہودیوں کو لگام دینے کے لیے ایک سخت قانون بنایا، لیکن ان سے بعض مراعات چھیننے سے گریز کیا۔ تاہم انہیں ہیکل کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کی تین مسجدیں عطا کر دیں۔ ۱۳۸۳ء میں پیڈرو سوم نے یہودیوں کو تمام سرکاری عہدوں سے ہٹا دیا۔ تمام یہود کو اپنے سینوں پر شناخت کے لیے امتیازی نشانات آویزاں کرنے کا حکم دے دیا گیا، تاکہ وہ عیسائیوں سے الگ شناخت ہو سکیں۔ اس طرح سپین میں ان کے اقتدار کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ عیسائیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہودی طبیبوں سے علاج نہیں کرائیں گے اور نہ ان کی ملازمت قبول کریں گے۔

۱۴۹۴ء میں سپین میں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد فرڈی نینڈ نے یہودیوں کے ساتھ زمانۂ جنگ کے تمام وعدے وعید بھلا کر ایک حکم جاری کیا کہ یا تو تمام غیر عیسائی اپنے اپنے مذاہب ترک کر دیں یا ملک سے نکل جائیں۔ یہود نے مزاحمت شروع کی تو حکومت نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ بے شمار یہودی زندہ جلا دیے گئے۔ باقی ملک چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یوں انہیں مسلمانوں سے بدعہدی اور غداری کرنے کا خوب مزا چکھنا پڑا۔

مصر کے یہودی

سپین کے بعد یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز مصر تھا۔ یہاں ۹۶۰ء میں مشرقی افریقہ کے عبیدیوں کی حکومت تھی انہوں نے اپنا شجرۂ نسب چونکہ حضرت جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے سے ملایا تھا، اس لیے وہ فاطمی کہلاتے تھے۔ بنو امیہ کے حکمرانوں کی طرح فاطمی بھی بڑے فراخ دل حکمران تھے۔ المعز فاطمی کے بعد اس کے بیٹے العزیز کا دور آیا تو اس نے ایک یہودی یعقوب بن کلس کو بغداد سے بلا کر وزیر بنایا۔ اس نے اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے باوجود وہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ بعد ازاں العزیز نے ایک عیسائی کو وزیر اعظم اور ایک یہودی کو اس کا نائب مقرر کر دیا۔ یروشلم کے عیسائی اسقف کی بہن سے شادی کر لی۔ اس کے بطن سے بیٹا عبدالحکیم پیدا ہوا جو ۹۹۶ء میں تخت نشین ہو گیا۔ عبدالحکیم عیسائی اسقف کا بھانجا ہونے کے باوجود عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے دونوں مذاہب کے پیروکاروں کو مار مار کر مصر سے نکال دیا۔ بعض یہود تو مسلمان ہو کر اپنے کاروبار سے چمٹے رہے لیکن زیادہ تر فرار ہو گئے۔ اس دور میں مصری یہود اتنے زیادہ خوشحال اور آزاد تھے کہ اس کی مثال اس دور کے کسی دوسرے ملک میں موجود نہ تھی۔

۱۱۶۸ء میں فاطمی خاندان کی حکومت کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی برسر اقتدار آ گئے۔ ان کے دربار کا طبیب خاص موسیٰ میمونی ایک یہودی تھا جو سپین سے فرار ہو کر مصر میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس نے "مشناتورہ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں تلمود کی متضاد اور متناقض تحریروں کو منطقی شکل دی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ یہودی مذہب ایک منطقی دین کے طور پر سامنے آیا۔ اس کتاب کی نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں یہ لکھا گیا تھا کہ "عیسیٰؑ اور محمد ﷺ انسانیت کو معراج پر پہنچانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے"۔

اس پر پوری دنیا میں ایک آگ لگ گئی۔ ہر جگہ اور ہر شہر میں اس کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ اس نظریے کے مخالفین کے نزدیک موسیٰ میمونی نے ان کے بنیادی مذہبی عقائد پر حملہ کیا تھا۔ چنانچہ یہودیوں نے عیسائیوں سے درخواست کی کہ اس کتاب کو سرعام نذر آتش کر دیا جائے۔ عیسائیوں نے یہودیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح میمونیوں کو کسی اور ملک میں تو کجا، مصر میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ تیرہویں صدی میں جب ایوبی خاندان کے بعد مملوک خاندان کا دور آیا تو انہوں نے یہود کو اپنی سلطنت سے خارج کر دیا۔ یوں مصر میں بھی وہ زوال کا شکار ہو گئے۔

آنحضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حملہ

صلیبی جنگوں کے دوران میں یہودیوں نے عیسائیوں کا جس بے حجابی سے ساتھ دیا، وہ ایک طویل داستان ہے۔ یہاں ان کی صرف ایک مکروہ سازش کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ سازش یہ تھی کہ سرور کائنات، خاتم الانبیاء ﷺ کے جسم اطہر کو روضہ اقدس سے نکال کر کہیں خفیہ جگہ پر پہنچا دیا جائے۔

یہ نورالدین زنگی کا عہد حکومت تھا۔ مسلمان فوج جرمنی کے شہنشاہ کونریڈ کی نو لاکھ مسلح فوج کے خلاف یروشلم میں نبرد آزما تھی کہ دہ مسکین صورت باریش یہودی مدینہ منورہ کے نواح میں وارد ہوئے۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ عبادت و ریاضت کے سوا بھی ان کا کوئی مقصد ہو سکتا ہے۔ دن بھر وہ دونوں درویش اللہ

اللہ کرتے رہتے اور رات کو اپنے حجرے میں سرنگ کھودتے رہتے تا کہ روضۂ اطہر تک پہنچ سکیں۔ یہاں تک کہ ان کی سرنگ روضہ کے بالکل قریب جا پہنچی۔ ایک رات نورالدین زنگی کو خواب میں آنحضور ﷺ نے اس کی اطلاع دی۔ وہ اگلے روز بہت پریشان رہا۔ دوسرا دن بھی پریشانی میں گزرا۔ تیسری رات اسے پھر یہی خواب نظر آیا، جس میں آنحضور ﷺ نے اس سے شدت کے ساتھ عمل کرنے کا تقاضا کیا۔ لیکن ہر چیز کو معمول پر پایا۔ اب حضور ﷺ نے بشارت میں ان یہودیوں کی شکلیں بھی اسے ذہن نشین کرادیں دوسرے دن نورالدین زنگی نے مدینہ شہر کے باشندوں کی دعوت طعام کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ کوئی شخص بھی شرکت کے بغیر نہ رہے۔

سلطان کے حکم کے مطابق لوگ آتے گئے اور کھاتے چلے گئے، مگر ان میں وہ دو شیطان صفت یہودی نظر نہ آئے۔ اب سلطان پھر بہت پریشان ہوا۔ وہ درویش آتے بھی کیسے، انہیں تو اس کی اطلاع بھی نہ تھی۔ ایک کدال لے کر سرنگ میں اتر جاتا اور دوسرا پہرہ دیتا اور عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ نورالدین زنگی نے منتظمین سے استفسار کیا کہ کوئی شخص شرکت سے رہ تو نہیں گیا۔ ایک اہلکار نے کہا: "پورا شہر آگیا ہے، البتہ دو عابد و زاہد افراد شامل نہیں ہو سکے، کیونکہ وہ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ انہیں کوئی ضیافت ذکرِ الٰہی سے نہیں روک سکتی"۔ سلطان نے کہا "سبحان اللہ کیا شان ہے ان کی! ہم خود ان کی زیارت کریں گے"۔ چنانچہ ملازمین کے سر پر کھانوں کے خوان اٹھوائے سلطان ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

پہرے دار یہودی کو دور سے نظر آیا کہ ایک چھوٹا سا قافلہ ہماری کٹیا کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے ساتھی کو اوپر بلایا۔ "دیکھو اتنے لوگ ہماری طرف ہی کیوں آرہے ہیں۔" اتنے میں سلطان نورالدین زنگی ان کے سر پر جا پہنچا۔ شکلیں وہی تھیں جو بشارت میں دکھائی گئی تھیں۔ دونوں کی مشکیں کسوادی گئیں۔ لوگ سناٹے میں آگئے۔ ان کی کٹیا کی تلاشی لی گئی تو بظاہر کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب ان کا مصلیٰ اٹھا کر دیکھا تو اس کے نیچے سرنگ کا دروازہ تھا۔ ان کے رنگ جو پہلے ہی فق تھے، اب مزید پیلے ہو گئے۔ اعتراف جرم کے سوا چارہ نہ تھا۔ سلطان نے سیسہ پگھلوا کر ان کے حلق میں انڈیلنے کا حکم دیا۔ یوں وہ کیفر کردار کو پہنچے۔ آئندہ ایسی صورتِ حال کی پیش بندی کے لیے روضہ اقدس کے گرد سات دھاتوں کی دیوار تعمیر کرادی جو آج تک جوں کی توں حالت میں ہے۔

ایسا خوفناک منصوبہ بنانے والوں کی پست ذہنیت یہود کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے! وہ مسلمانانِ عالم کی نفرت کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ان کی اسی ذہنیت نے دنیا بھر میں انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے۔ مسلمانوں کی نفرت ڈھکی چھپی نہیں، خود عیسائی بھی جو تاریخ کے بعض مرحلوں میں ان کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں، ان سے نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بانیانِ پاکستان کی آراء

علامہ اقبال

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے سازش کے ذریعہ عربوں اور ترکوں کو آپس میں لڑا کر بیت المقدس سے ترکوں کو بے دخل کر دیا اور عربوں کو کئی ملکوں میں تقسیم کرنے کے بعد اپنی اجارہ داری قائم کی۔ اسی دوران 1917 میں برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے "اعلان بالفور" کے ذریعہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی[53] یہودیوں نے فلسطینیوں سے منہ مانگے داموں جائیدادیں خریدیں اور جنہوں نے انکار کیا انہیں برطانوی حکومت کے تعاون سے بے دخل کیا۔ دستاویزات کے ذریعہ ثابت کیا کہ یہ جائیداد دو ہزار سال قبل ہمارے بزرگ کے نام پر تھی۔ علامہ اقبال نے اس پر تبصرہ کیا کہ

ہے خاک فلسطین پر یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟

قائداعظم محمد علی جناح

اسرائیل کے قیام کے بعد قائداعظم نے فرمایا تھا کہ اسرائیل مغربی دنیا کا ناجائز بچہ ہے، جب 25 اکتوبر 1947 کو قیام اسرائیل کا منصوبہ پیش کیا گیا تو قائداعظم نے رائٹر نیوز ایجنسی کو انٹرویو میں فرمایا:

---

[53] برقی معلومات، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، Balfour Declaration,2012، شکاگو

فلسطین کے بارے میں ہمارے موقف کی وضاحت اقوام متحدہ میں پاکستان وفد کے سربراہ نے کر دی ہے۔ مجھے اب بھی یہ امید ہے کہ تقسیم فلسطین کس منصوبہ مسترد کر دیا جائے گا ورنہ ایک خوفناک چپقلش کا شروع ہونا ناگزیر اور لازمی امر ہے۔ یہ چپقلش صرف عربوں اور منصوبہ تقسیم کرنے والوں کے درمیان نہ ہو گی بلکہ پوری اسلامی دنیا اس فیصلہ کے خلاف عملی بغاوت کرے گی کیونکہ ایسے فیصلے کی حمایت نہ تاریخی اعتبار سے کی جاسکتی اور نہ ہی سیاسی اور اخلاقی طور پر۔ ایسے حالات میں پاکستان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہو گا کہ عربوں کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کرے اور خوامخواہ کے اشتعال اور دست درازیوں کو روکنے کے لئے جو کچھ اس کے بس میں ہے پورے جوش و خروش اور طاقت سے بروئے کار لائے"

اہل علم و دانش کی آراء

ایڈورڈ سعید

ایڈورڈ سعید کا شمار دنیا کے مشہور و معروف مفکرین میں ہوتا ہے جو فلسطین کے ایک عیسائی گھرانے میں 1935ء میں پیدا ہوئے۔ جب 1947ء میں فلسطین کا مسئلہ پیش آیا تو سعید اپنے خاندان کے ہمراہ پہلے قاہرہ اور اس کے بعد 1950ء میں امریکہ منتقل ہوئے۔ ایڈورڈ 1957ء میں پرنسٹن یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی سے انگریزی زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا۔ پھر 1962ء میں ہارورڈ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایڈورڈ سعید استشراق (Orientalism) کے زبردست ماہر تھے اور استشراقی فکر کے زبردست ناقد بھی تھے۔ انھوں نے استشراق یا مستشرقین یا مغربی مصنفین کو مشرق کے تئیں پھر سے سوچنے پر مجبور کیا۔ 1978ء میں Orientalism کے نام سے زبردست کتاب لکھی جس میں واضح کیا ہے کہ مغربی مصنفین اور مستشرقین نے مشرقی دنیا کی تصویر نسلی امتیاز اور سامراجی سوچ اور نظریہ کی بنیاد پر کھینچی ہے اور مغرب نے نو آبادیاتی ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کا نقشہ پیش کیا ہے۔

ایڈورڈ سعید کے مطابق مغربی میڈیا نے مسلم دنیا یا مشرقی دنیا کی نہایت منفی تصویر پیش کی ہے اور اپنی تحریروں میں ان تمام غلط فہمیوں کا جائزہ لیا جو اسلام، عرب دنیا اور فلسطین کے بارے میں پھلائے گئے تھے[54]۔ انھوں نے اس کتاب میں اسلام اور اہل اسلام کی بہترین نمائندگی کی۔ ایڈورڈ اکثر اسلامی مطالعات یا عربوں کو مغربی انداز سے سوچنے پر تنقید کرتے تھے۔ ایڈورڈ مسئلہ فلسطین کے تعلق سے نہایت متحرک رہتے تھے۔ انھوں نے مغربی دنیا میں مسئلہ فلسطین بہترین انداز میں اجاگر کیا اور اس تعلق سے The Question of Palestine کے عنوان سے کتاب بھی لکھی جس میں انھوں نے صیہونیت اور یہودیوں کی تاریخ بیان کر کے ان کے ناپاک عزائم کو سامنے لائے۔

ڈاکٹر ایلمر بلجر

یہود کے خالص مذہبی عناصر بھی اسرائیل کے قیام کو جائز نہیں سمجھتے۔ معروف یہودی اسکالر ڈاکٹر ایلمر بلجر نے اپنے مقالہ "کیا اسرائیل بائیبل کی پیشن گوئیوں کی تکمیل ہے" میں لکھا ہے کہ "یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کوئی پکا مذہبی یہودی یہ نہیں مانتا کہ موجودہ اسرائیلی ریاست اس طریقہ عمل سے وجود میں آئی ہے جو بائیبل کے احکام سے ذرہ بھر بھی مطابقت رکھتا ہو"[55]۔

ڈاکٹر فرید عباس

اپنے تحقیقی مقالہ میں تسلیم کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ نے اس ضمن میں عدل کے تقاضے پورے نہیں کئے اور 1948 میں عظیم انسانی بحران پیدا ہو جب جنگ فلسطین میں 750000 فلسطینی مسلمان بے گھر ہوئے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ 29 نومبر 1947 میں پاس ہونے والے ریزولوشن نمبر (II)1819 کے مطابق فلسطین کو آٹھ حصوں میں

---

[54] Edward W. Said, The Question of Palestine, Vintage Books, New York, October 1980, Page 56-57

[55] برقی معلومات، 18 جون 2012ء/ Israel:Fulfillment of Bibilicle Prophecy,www.radiwislam,org

تقسیم ہونا تھا جس میں تین عرب، تین یہودی، حیفہ کا عرب علاقہ جو یہودی علاقہ کے درمیان ہو گا اور آخری یروشلم کی آزاد حکومت جو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ہو گی۔ لیکن اس منصوبہ پر عمل اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق بھی نہ ہو سکا۔[56]

سید ابوالاعلیٰ مودودی[57]

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دوہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ 90 سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد اقصٰی اور قبہ صخریٰ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقامات مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جز کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ (1967) ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اسکے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام سے شدید ردعمل کا اندیشہ ہے (یہ 50 سال پہلے کی بات ہے)۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر نو مسیح ہی آکر کرے گا، جب تک وہ نہ آجائے ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ (واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال قرار دیا ہے)۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو شدت پسند ہے اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، وہ کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوار گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دور مسیحائی میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربی نے تورات ہاتھ میں لے کر اس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوار گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ "آج ہم ملت یہود کے لیے دور مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں۔" انہی دو وجوہ سے مسجد اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے (اگست 1969) تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لئے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جز اس منصوبے کا یہ کہ "میراث کے ملک" پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اس ضمن میں مڈل ایسٹ فورم کی ویب سائٹ پر موجود ڈینئل پائپز کا ایک مضمون موجود ہے جس میں اس نے یروشلم کمیٹی مؤرخہ 6 اپریل 1990ء میں ہونے والی تقریر کا حوالہ دیا ہے جس میں ان عزائم کا اظہار ہے کہ

اس بارے میں کوئی دستاویزی، نقشہ یا تصویری ثبوت موجود نہیں کہ یہ عبارت Knesset پر لکھی ہے۔ اسرائیلی اس کی تردید کرتے ہیں۔

دنیا میں صرف اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ اور جگر تھام کر سنیے مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردعمل بھی مسجد اقصٰی کی آتشزدگی (1969) پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکا، تو پھر خاکم بدہن ہمیں وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں۔

---

[56] Syed Farid Abbas, Covering Islam:Challenges & Oppurtunities for Media,2005,RIMA, Singapore Page 7

[57] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، یہودیت: قرآن کی روشنی میں، ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، طبع چہارم، 2000ء

مسئلہ فلسطین کا آغاز عرب بدوں کی غداری کی وجہ سے خلافت عثمانیہ کی فوجوں کی پسپائی سے شروع ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران ہی 16 مئی 1916ء کو حکومت برطانیہ اور فرانس کے درمیان خفیہ معاہدہ سائیکوس-پیکوٹ معاہدہ طے پایا۔ جس میں دونوں ممالک نے جنگ عظیم اول کے بعد اور سلطنت عثمانیہ کے ممکنہ خاتمے کے پیش نظر مشرق وسطی میں اپنے حلقۂ اثر کا تعین کیا۔ اس معاہدے میں برطانیہ نے یہودیوں سے کیے گئے وعدے کی تکمیل کے لیے "بالفور ڈیکلریشن مینڈیٹ کا علاقہ "بطور فلسطین ایک الگ خود مختار ملک تخلیق کیا۔ میں "حیفہ کے مشرق میں تاریخی طور پر لبنان کے علاقے سے لے کر "ٹرانس جورڈن" تک اور مصر صحرائے سینا سے متصل اور غزہ کو شامل کیا گیا تھا۔ اس کا دار لحکومت بیت المقدس (یروشلم) کو قرار دیا گیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اُس وقت فلسطین کی حدود میں موجودہ اردن کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ سارا علاقہ کبھی فلسطین نہیں کہلاتا تھا۔ فلسطین تاریخ طور پر "دریائے اردن" کے مغربی کنارے سے لے کر "رام اللہ"، "نابلوس"، "رملی" اور "یافا" تک کا علاقہ کہلاتا تھا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں "ہیبرون اور "غزہ" تاریخ کے مختلف ادوار میں فلسطین کا حصہ رہے ہیں۔ البتہ "ناصرون"، "حیفہ" اور ان سے آگلے علاقے تاریخی طور پر لبنان کا حصہ تھے۔ "بیر سبعہ" کا سارا علاقہ مصر کا حصہ تھا۔

9 دسمبر 1917 برطانوی افواج کے کمانڈر جنرل ایڈمنڈ کے "بیت المقدس" میں داخلے کے فوری بعد ہی "بالفور ڈیکلریشن مینڈیٹ" پر عمل شروع ہو گیا۔ 19 سے 26 اپریل 1920 کے دوران اٹلی کے شہر "سان ریمو" میں ہونی والی عالمی کانفرنس میں دیگر ممالک کے ساتھ نئے تخلیق شدہ ملک فلسطین کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ 10 اگست 1920ء کو معاہدہ سیورے (Treaty of Sevres) کے تحت "اتحادی قوتوں" نے ترکی سے اس آزادی کو تسلیم بھی کروالیا۔ 11 ستمبر 1922 کو "لیگ آف نیشن" نے الگ ملک فلسطین کے باضابطہ قیام کی منظوری دیتے ہوئے اسے "برطانیہ کی تولیت "میں دے دیا۔

"لیگ آف نیشنس کی فلسطین کی تولیت کی برطانوی مینڈیٹ ڈیڈ" کے آرٹیکل 2 میں واضع طور پر درج ہے کہ "برطانوی انتظامیہ لازمی ملک (فلسطین) کو سیاسی، انتظامی اور معاشی طور پر ایسے حالات میں رکھنے کا ذمہ دار ہے جو 'یہودی قومی گھر' کے قیام کی ضمانت دیتے ہوں"۔ ایسی دستاویز کے آرٹیکل 4 میں مذکور ہے۔ "یہودی قومی گھر کے قیام اور فلسطین میں یہودی آبادی کے مفادات کو متاثر کرنے والے اور معاشی و معاشرتی امور اور دیگر معاملات میں فلسطین کے انتظامیہ کے ساتھ مشورے اور تعاون کرنے کے لئے "عالمی صہیونی ایسوسی ایشن" کو ایک عوامی ایجنسی کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ 'عالمی صیہونی ایسوسی ایشن' کو برطانوی حکومت سے مشاورت سے وہ تمام ضروری اقدامات کرنے کی آزادی ہو گی جو ان تمام یہودیوں کے لیے مدد گار ہوں جو یہودی وطن کے قیام میں شامل ہونا چاہتے ہوں۔ آرٹیکل 22 میں درج ہے: "انگریزی، عربی اور عبرانی فلسطین کی سرکاری زبانیں ہوں گی، اور فلسطین میں استعمال ہونے والے ڈاک ٹکٹ یا کرنسی پر عربی میں لکھے جانے والے ہر فقرے یا تحریر کو عبرانی زبان میں دہرایا جانا چاہئے"۔

برطانوی دور میں یہودیوں کو فلسطین لانے کے لیے پوری دنیا میں ترغیبی مہمات چلائیں گئیں۔ فلسطین ہجرت کرنے والوں کے لیے مراعاتی پیکجز پیش کیے گئے۔ تمام بڑے بڑے یہوی ناموں نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا ردعمل مایوس کُن تھا۔ لیگ آف نیشن اور برطانوی انتظامیہ دونوں کے اعداد و شمار کے مطابق 1920 اور 1945 کے درمیان کل 304، 33 یہودیوں نے یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ سے فلسطین ہجرت کی۔ جس کی وجہ سے نہ تو مقامی آبادی کے تناسب میں کوئی خاص فرق پڑا اور نہ ہی یہود، مسلم محاذ آرائی شروع ہو سکی۔

20 نومبر 1935 میں برطانوی فوج نے معروف شامی مجاہد شیخ محمد عزالدین بن عبد القادر القسام کو حیفہ کے قریب شہید کر دیا۔ جس پر فلسطینی مسلمان بھڑک اٹھے۔ برطانوی انتظامیہ کے خلاف جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس موقعہ پر صہیونی تنظیم نے برطانیہ کے حق میں مظاہرے کیے۔ اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروع کرنے والی تقاریر کیں۔ جن کی وجہ سے پہلی بار مسلمان یہود تصادم ہوئے۔

ان معمولی سے تصادم کو بنیاد بنا کر برطانوی حکومت نے یہودیوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ صہیونی تنظیم نے برطانوی فوج کے تعاون اور امداد سے مختلف علاقوں میں اپنے "اسٹرن اور ارگون" جیسے درجنوں گینگ بنا لیے۔ تشدد کی تحقیقات کرنے والے برطانوی انتظامیہ کے "رائل پیل کمیشن" کے اعداد و شمار کے مطابق 1936 اور 1937 کے 18

ماہ کے درمیان یہودی دہشت گرد گروپوں کے حملوں میں 5 ہزار فلسطینی عرب ہلاک اور 10 ہزار زخمی ہوئے۔(مسلمانوں کا دعویٰ اس سے تین گنا زیادہ کا ہے) فلسطین میں مسلسل یہودی دہشت گردی کے نتیجے میں عالم اسلام خصوصا عرب ممالک میں شدید جذبات سامنے آئے۔ جس سے مصر اور عراق میں بلخصوص برطانوی مفادات کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ برطانیہ نے مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے 1939 میں یہود کی مزید فلسطین ہجرت پر پابندی عاید کر دی۔ جس کے جواب میں صہیونی تنظیم نے برطانوی انتظامیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان بغاوت میں کہا گیا کہ برطانیہ چونکہ یہود کے دشمن نازیوں سے بر سرپیکار ہے اس لیے صہیونی براہ راست اُسے نشانہ نہیں بنائیں گے۔ بلکہ برطانوی انتظامیہ کے لیے کام کرنے والے مسلمان، اُن کے اہل خانہ اور املاک صہیونی دہشت گرد تنظیموں کا ہدف ہونگے۔ 1939 سے 1945 کے دوران ہزاروں مسلمان فلسطینی صہیونی دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ دوسری طرف برطانوی انتظامیہ نے یہودی دہشت گردی کو کچلنے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

مسلمانوں کی بار بار کی اپیلیوں کے جواب میں برطانوی افسران کا جواب ہوتا کہ جنگی حالات میں نیا محاذ نہیں کھولا جا سکتا۔ جنگ کے اختتام پر دہشت گردی کرنے والوں کو قانون کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ اسی دوران یورپ سے جنگ کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں یہودیوں کی ہجرت میں تیزی آگئی۔ 1939 سے 1945 کے دوران 60 ہزار کے قریب غیر قانونی یہودی تارکین وطن یہودی فلسطین میں داخل ہوئے۔ جبکہ ایک لاکھ کے قریب یہودیوں کو اتحادی افواج نے پناہ گزین کے طور پر فلسطین پہنچایا۔

3 جولائی 1944 کو برطانوی انتظامیہ نے اتحادی افواج میں یہودی بر گیڈ کے قیام کا اعلان کیا۔ کہا گیا کہ جو یہودی دہشت گردی میں میں ملوث نہ ہونے یا تائب ہونے کی یقین دھانی کرائیں گے وہ اس بر گیڈ میں بھرتی ہو سکتے ہیں۔ برطانیہ نے یہودی بر گیڈ کو اعلیٰ پائے کی عسکری تربیت دی اور اُنہیں اُس وقت کے جدید ترین اسلحے سے لیس کیا۔

یہاں واضع رہے 1945 کے اختتام تک، یہودی فلسطینیوں کی کل آبادی کا صرف 16٪ تھے اور انکی میں ملکیت میں صرف 3٪ زمین تھی۔ کیوں کہ ان کی اکثریت غیر قانونی تارکین وطن اور پناہ گزینوں پر مشتعمل تھی۔

1946 میں برطانیہ نے یہودی آبادکاری سے مکمل پاک اور گنجان مسلم آبادی والا علاقہ فلسطین سے کاٹ کر الگ ملک اردن بنا دیا۔ اور اُسے خلافت عثمانیہ سے غداری کرنے والے ھاشمی خاندان کے حوالے کر دیا۔ جہاں آج اردن کی بادشاہت قائم ہے۔ اردن کے فلسطین سے کٹ جانے سے آبادی کے تناسب میں خاصہ فرق پڑھ گیا۔ یہودیوں کی باقی ماندہ فلسطین میں تعداد 16 فیصد سے بڑھ کر تیس فیصد سے زیادہ ہوگئی۔

ایک لاکھ یہودیوں کو یورپ سے فلسطین منتقل کرنے اور مسلمان آبادی کا بڑا حصہ الگ کرنے کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج اور ہڑتالیں کیں۔ جس کے جواب میں صہیونی دہشت گردی میں تیزی آگئی۔ اس دہشت گردی میں برطانیہ کی زیر کمان یہوندی بر گیڈ بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ حالات کی خرابی کا بہانہ بنا کر 18 فروری 1947 میں برطانوی کابینہ نے فلسطین سے دستبرداری اور معاملہ اقوام متحدہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپریل 1948 کو ہیفہ میں موجود شمالی سیکٹر کے برطانوی کمانڈر میجر جنرل ہیو اسٹاک ویل برطانیہ نے فلسطین سے اپنی فوجوں اور سول انتظامیہ کے انخلا کے موقعہ پر اسلحہ اور تنصیبات "یہودی بر گیڈ" کے حوالے کر دیں۔

برطانوی دستبرداری کے ساتھ ہی صہیونی تنظیم نے مسلمانوں کے قتل عام شروع کر دیا۔ صیونی لیڈر اور اسرائیل کے پہلے صدر بین گوریئن نے بیان جاری کیا کہ "فلسطینی مسلمان یہودی ریاست کے لیے غدار (fifth columnist) بن سکتے ہیں، اس لیے انہیں بڑے پیمانے پر گرفتار ملک بدر کرنا ضروی ہے۔ گرفتار کرنے کی نسبت انہیں انھیں ملک بدر کیا جانا بہتر ہے۔

یہودی بر گیڈ کے کمانڈر اور بعد میں اسرائیلی افواج کے پہلے کمانڈر انچیف "موردچائی مکلیف" نے حائفہ میں فلسطینیوں کی نسلی صفائی کی مہم کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو سیدھا اور آسان حکم تحریری طور پر جاری کیا تھا "جس بھی عرب سے آپ کا سامنا ہو اسے مار ڈالو۔ دھماکا خیز مواد سے تمام جلنے والی اشیاء کو جلا دو"۔

فلسطین میں مسلمانوں کی نسلی صفائی کو "آپریشن کینسر" کا نام دیا گیا تھا۔ جس میں یہودی بر گیڈ کے ساتھ ہاگانا، پاماچ اور ارگن جیسی صیہونی دہشت گرد تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ "تبیریہ" فلسطین کا پہلا بڑا شہر تھا جو صیہونی دہشت گردی کا نشانہ بنا۔ جہاں ایک بھی مسلمان کو رہنے نہیں دیا گیا۔ حیفہ دہشت گردی کا شکار دوسرا بڑا شہر بنا۔ اپریل 1948 کو یہودی فوجوں نے "دیر یاسین" کے علاقے میں قتل عام کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو مختلف دیہاتوں سے ایک جگہ جمع کیا گیا۔ خواتین کو سب کے سامنے زیادتی کا نشانہ بنایا، پھر بچوں کو الگ کر کے زبح کیا۔ اور مردوں کو مشین گن کی گولیاں مار کر شہید کر دیا۔ اس قتل عام سے معجزانہ طور پر بچ جانے والے 12 سالہ لڑکے "، فہیم زائدان" نے عشروں بعد اپنی یاداشتیں شائع کرائیں تو دنیا کو اس کے بارے میں علم ہوا۔

کم تعداد یہودیوں کے لیے مسلمان اکثریت کو قتل کرنا ایک مشقت طلب کام تھا۔ جس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اسرائیل کے پہلے صدر اور معروف کیمادان بین گوریون نے ایک مہلک ہتھیار تیار کیا تھا جو فلسطینیوں کے کھیتوں اور مکانات کو آگ لگانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم میں حیاتیاتی جنگ کے آلات بھی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے گئے۔

1948 کے آخر تک صیہونیوں نے فلسطین کی 80 فیصد سے زیادہ اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں کے 531 دیہات اور قصبات مکمل تباہ کر دیے گئے تھے۔ "عالمی ادارے" مسلمانوں کے کے ساتھ تمام تر تعصب اور اسرائیل کی ہمدردیوں کے باوجود فلسطینیوں کے 31 بڑے قتل عام کیے جانے کی تصدیق کرتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں ہزاروں کی تعداد میں فلسطینی عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر کے منظم منصوبہ بندی کے تحت قتل کیا گیا۔ 80 بڑے شہروں سے مسلمانوں کا وجود مٹا ڈالا گیا۔ 8 لاکھ فلسطینی مسلمان اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ مارے گئے۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے 19 اپریل 2002ء کو مشرق وسطیٰ کا آتش فشاں کے عنوان سے اپنے خطاب جمعہ [58] میں فرمایا:

مشرق وسطیٰ میں فلسطین کے حوالے سے حالیہ انتفاضہ کی تحریک تقریباً ڈیڑھ سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس معاملے میں اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کی طرف سے خونخواری اور بربریت کا جو بدترین مظاہرہ ہو رہا ہے اس سے مشرق وسطیٰ کی صورت حال واقعتاً ایک ایسے آتش فشاں سے مشابہہ نظر آتی ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

اس سے قبل تقریباً دس سال امن مذاکرات کا ایک طویل سلسلہ گزرا ہے۔ یہ مذکرات خلیج کی جنگ کے فوراً بعد شروع ہوئے تھے۔ ان مذاکرات کا آغاز ہسپانیہ کے صدر مقام میڈرڈ سے ہوا تھا، جہاں سے یہ اوسلو منتقل ہوئے، پھر یہ مذاکرات کئی بار واشنگٹن میں ہوئے، پھر کیمپ ڈیوڈ میں ہوئے۔ بہر حال ان مذاکرات کا یہ سلسلہ ابھی چل رہا تھا اور ایک حد تک اس بات پر مفاہمت ہو گئی تھی کہ اسرائیل وہ علاقے خالی کر دے جو اس نے 1967ء کی جنگ میں چھینے تھے تا کہ ایک فلسطینی ریاست وجود میں آجائے جبکہ یروشلم کا معاملہ بعد میں طے کریں گے۔ اسی طرح 35 لاکھ فلسطینی مہاجرین کے بارے میں جو اسرائیل سے نکالے گئے تھے، فلسطینیوں کا مطالبہ بھی کہ انہیں واپس اسرائیل میں آکر آباد ہونے کی اجازت ہونی چاہیے، ابھی تصفیہ طلب تھے۔ لیکن جب یہ مذاکرات اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور یروشلم کا مسئلہ زیر بحث تھا تو شیرون نے جو اس وقت وزیر اعظم نہیں تھا (اس وقت ایہود بارک وزیر اعظم تھے) Temple Mount کا دورہ کیا۔ یہ مقام یعنی قبۃ الصخرہ مسلمانوں کے لیے انتہائی مقدس ہے کیونکہ حضور ﷺ اسی مقام سے معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ دوسری طرح یہودی کہتے ہیں کہ اس چٹان پر ہمارا ہیکل سلیمانی تھا جسے وہ دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسے تعمیر کرنے کے لیے ان کا منصوبہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ گرایا جائے۔ بہر حال جب شیرون یہاں آیا تو اس نے اعلان کیا کہ ہم جلد ہی یہاں اپنے تیسرے ہیکل کی بنیادیں رکھ دیں گے، جس کے لیے بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں تیار کر لی گئی ہیں، اس پر مسلمانوں میں رد عمل ہوا۔ نوجوانوں نے پتھراؤ کیا تو یہ انتفاضہ شروع ہو گیا جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے جاری ہے۔ یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے آج جنین کے کیمپ کے قتل عام تک آن پہنچا ہے۔ یہ ظلم پوری دنیا کی نگاہوں کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے ہو رہا ہے۔ بہر حال شیرون کی اس شرارت اور دھاندلی کا

---

[58] ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور، "فلسطین نمبر" جون 2002

نتیجہ یہ نکلا کہ دس سال سے چلنے والے امن مذاکرات میں ہونے والی پیش رفت زیرو ہو گئی۔ چنانچہ اب مشرقِ وسطیٰ کے جو حالات سامنے آرہے ہیں وہ بہت خوفناک ہیں۔ عالمی میڈیا نے ان حالات کو "The Nightmare Scenario" (انتہائی ہیبت ناک منظر) کا عنوان دیا ہے۔

اس پوری صورت حال کے پس منظر کے ضمن میں تین باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بات یہ کہ یہود سابقہ امت مسلمہ تھے جبکہ موجودہ مسلمان امت، امت محمدی ﷺ ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد یہود اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اس منصب سے معزول کر دیئے گئے اور معزولی کی علامت کے طور پر ہجرت مدینہ کے سوا سال بعد اہلِ توحید کا قبلہ بدل دیا گیا۔ دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ ان دونوں امتوں کے بارے میں قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پہلے ہی سے بتا دیا تھا کہ ان دونوں پر عروج اور زوال کے دو، دو ادوار آئیں گے۔ یہود کا آخری دورِ زوال سن ۷۰ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک جاری رہا۔ ۷۰ء میں رومیوں نے ان کا Second Temple گرایا۔ اس وقت لاکھوں یہودی قتل کیے گئے اور باقی یہودیوں کو یروشلم سے نکال دیا گیا جو یورپ، ایشیا، امریکہ سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اس دور کو وہ "ڈایاسپورا" کہتے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے انہوں نے برطانیہ سے اپنا یہ حق منوالیا کہ اب ہم فلسطین میں آباد ہو سکتے ہیں۔ گویا تقریباً ۱۹۰۰ برس بعد وہ دوبارہ ارضِ فلسطین میں آباد ہوئے۔ لیکن اس عرصہ سے پہلے ان پر زوال کا ایک اور عروج کے دو ادوار آچکے تھے۔ دوسرا زوال دو ہزار برس طویل تھا۔

امت محمد ﷺ پر بھی دو عروج آچکے ہیں۔ پہلا عروج عربوں کے ہاتھوں اور دوسرا ترکوں کی زیر قیادت تھا۔ ہمارا دوسرا زوال سقوط غرناطہ سے شروع ہوا جب ہسپانیہ میں اسلامی حکومت ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہمارا زوال اپنے کلائمیکس پر اس وقت پہنچا جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد سلطنتِ عثمانیہ ختم ہوئی۔ اس پس منظر میں نوٹ کیجیے کہ یہودیوں نے بڑی طویل جدوجہد کے ذریعے رفتہ رفتہ عیسائیوں پر اپنا تسلط قائم کیا جس کی تعبیر علامہ اقبالؒ نے یوں کی کہ ع "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے"۔ خاص طور پر پروٹسٹنٹ عیسائی مذہب تو یہودیوں ہی کی ایجاد تھا۔ ان پروٹسٹنٹس کے ذریعے انہوں نے یورپ میں اقتدار حاصل کیا اور یوں اس خطے کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اس وقت پروٹسٹنٹ عیسائی دنیا کی قیادت امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ سے پہلے برطانیہ ان کا نمائندہ تھا کہ جس کے ذریعے یہود نے فلسطین میں آباد ہونے کا حق حاصل کر لیا۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹس کا پشت پناہ امریکہ بنا۔ لہٰذا اب اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں اسرائیل ایک نہیں، تین ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ ایک اسرائیل جو مڈل ایسٹ میں ہے، دوسرا اسرائیل برطانیہ ہے اور تیسرا اسرائیل امریکہ ہے۔ یہ بات پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ایک رسالے "Trumpet" نے جو فلاڈلفیا سے نکلتا ہے، لکھی ہے کہ اصل اسرائیل تو امریکہ اور برطانیہ ہیں، مڈل ایسٹ میں موجود اسرائیل کی حیثیت تو ایک جڑ ہے۔

اب آیئے موجودہ صورت حال کی طرف! موجودہ منظر یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں دراصل دو بہت بڑے بڑے آئس برگ ٹکرانے والے ہیں۔ "Tip of the Iceberg" محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دراصل سمندر کی سطح کے نیچے آئس برگ بہت بڑی شے ہوتی ہے، لیکن اوپر اس کا صرف چھوٹا سا سرا (Tip) نظر آتا ہے۔ اسی لیے جہاز دھوکا کھا کر اس سے ٹکرا جاتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ یہ دو آئس برگ جن میں سے ایک کی Tip وہ یہودی ہیں جو ۳۵ لاکھ کے قریب اسرائیل میں آباد ہیں، جبکہ دوسرے آئس برگ کی Tip فلسطینی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ وہ بھی تقریباً ۳۰ سے ۳۵ لاکھ ہیں۔ لیکن یہ کہ ان Tips کے نیچے کیا ہے؟ اسرائیل کے نیچے پوری دنیا کے ایک کروڑ یہودی اور ان کی پشت پر عیسائی دنیا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہود کے اصل آلہ کار تو برطانیہ اور امریکہ ہیں لیکن ایک درجے میں کیتھولک دنیا بھی ان کی پشت پناہ ہے۔ یہ سب ملا کر تقریباً پونے دو ارب بنتے ہیں۔ فلسطینیوں کے پیچھے ۳۰ کروڑ عرب عوام اور بقیہ عالم اسلام موجود ہے۔ یہ کل ڈیڑھ ارب ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر Dome of the Rock کو گرا دیا جائے تو پوری دنیا میں جو طوفان اٹھے گا اور رد عمل کے طور پر ان دونوں کے ٹکرانے سے خوفناک منظر سامنے آئے گا، اس کی ہولناکی محتاج بیان نہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں اگر یہ بھٹی دہکی تو ابتدا میں مسلمانوں بالخصوص عربوں کا شدید نقصان ہو گا۔ اصل میں یہ اللہ کا عذاب ہو گا جو ایک ملعون اور مغضوب علیہم قوم کے ہاتھوں ان پر آئے گا۔ دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں عربوں کا جرم اس اعتبار سے زیادہ بڑا ہے کہ انہوں نے اس فضیلت کے باوجود کہ نبی اکرم ﷺ انہی میں سے تھے اور انہی کی زبان میں اللہ کا کلام نازل ہوا، نو آبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے بعد دین سے بے وفائی کا معاملہ کیا اور اللہ کی بجائے کسی نے ماسکو کو اپنا قبلہ بنا لیا اور کسی نے واشنگٹن کی طرف رخ کر لیا۔

اس وقت جو صورتِ حال ہے اور یہ جو تصادم ہونے والا ہے، آیئے ذرا اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔ قرآن مجید میں یہود کے بارے میں ایک جگہ آیا ہے (لَیسُوا سَوَاءً) کہ وہ سب کے سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ بعینہٖ یہودیوں میں اور مسلمانوں میں آج بھی دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک نقطہ نظر جو ابتدا میں سب مسلمانوں کا تھا،

اور اصولی اعتبار سے بالکل درست مؤقف تھا، یہ ہے کہ اسرائیل کا قیام غلط اور بہت بڑا ظلم ہے، اسرائیل کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ یہاں پر یہودیوں کو لا کر آباد کیا جاتا۔ یہ انگریزوں اور امریکیوں کی بہت گہری سازش اور ظلم ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

دو ہزار برس پہلے کے نکلے ہوئے یہودیوں کو اگر آج یہاں دوبارہ لا کر آباد کرنا عدل کا تقاضا ہے تو پھر عربوں کو بھی ہسپانیہ میں آباد کیا جانا چاہیے کہ وہ تو صرف پانچ سو برس پہلے وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ پھر پورے ہندوستان پر بھی مسلمانوں کا حق ہے۔ ۱۸ویں صدی عیسوی کے آغاز میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دورِ حکومت تک پورا ہندوستان مسلمانوں ہی کی زیر نگین تھا۔ لہٰذا اگر یہودی دوبارہ ارضِ فلسطین پر آباد کیے جاسکتے ہیں تو مسلمانوں کو سارا ہندوستان دوبارہ ملنا چاہیے۔ بہر حال ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ جس چیز کی بنیاد دھونس، دھاندلی، ظلم اور ناانصافی پر ہو اس کو باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ انتہائی لیکن اصولی نقطہ نظر ابتداء میں عربوں کا رہا ہے۔ عجم میں بھی صرف دو ملکوں ترکی اور ایران نے اسرائیل کو تسلیم کیا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ مسلمانوں اور عربوں کے اس مؤقف میں کمزوری پیدا ہوئی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

دنیا کا اصول تو یہی ہے۔ بہر حال عربوں نے جب دیکھا کہ ہم اسرائیل کے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکتے، امریکہ اس کا پشت پناہ ہے تو انہوں نے ایک ایک کر کے صلح کرنی شروع کی۔ پہلے سادات نے صلح کی۔ اس کے بعد شرق اردن نے صلح کر لی۔ اب شاہ عبدالعزیز کے بیٹے شاہ عبداللہ، ولی عہد سعودی عرب نے یہ کہا ہے کہ اگر اسرائیل اپنی ۱۹۶۷ء سے قبل کی حدود میں واپس چلا جائے اور سارے علاقے خالی کر دے اور وہاں فلسطینی ریاست قائم ہو جائے تو تمام عرب ممالک اسے تسلیم کر لیں گے۔ اس پر تمام عرب ممالک متفق ہو گئے ہیں۔ دنیا میں صرف ایک ملک پاکستان ہے جس نے ابھی تک اس مفاہمتی فارمولے کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن اگر سارے عرب ممالک ایسا کر لیں گے تو پاکستان اکیلا کیسے کھڑا رہ جائے گا! اصل غور طلب بات یہ ہے کہ ہم میں یہ کمزوری کیوں آئی۔ وجہ وہی ہے کہ ہم نے اللہ اور اس کے دین سے غداری اور بے وفائی کی۔ اللہ سے ہم نے اپنا رخ موڑ لیا تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے۔ اگر تم اس کی طرف چل کر آؤ گے تو وہ دوڑ کر آئے گا۔ تم بالشت بھر آؤ گے تو وہ ہاتھ بھر آئے گا۔ لیکن اگر تم لوگ منہ موڑ لو گے تو وہ بھی اپنا رخ تم سے پھیر لے گا۔ بہر حال یہ دو موقف موجودہ صورتِ حال میں مسلمانوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

اسی طریقے سے یہودیوں میں بھی دو طبقات ہیں۔ ایک طبقہ مذہبی یہودیوں کا ہے، دوسرا سیکولر یہودیوں کا۔ یہودیوں میں جو انتہا پسند یعنی مذہبی یہودی ہے، وہ ہر حال میں گریٹر اسرائیل بنانا چاہتا ہے جس میں مصر کا بہت بڑا علاقہ، پورا صحرائے سینا، پورا لبنان، پورا اردن، سعودی عرب کا شمالی حصہ، مکمل عراق اور شام اور ترکی کے کچھ جنوبی حصے شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ ہمیشہ سے امن مذاکرات کا مخالف رہا ہے۔ جب ان مذاکرات کا سلسلہ چلا اور اسحاق رابن دستخط کر کے آیا تو اسے ایک یہودی نے قتل کر دیا کہ تم کون ہوتے ہو ہمارے علاقے واپس کرنے والے، ہمیں عربوں سے ابھی اور علاقے لینے ہیں اور گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یروشلم کے معاملے میں ہم کسی کی کوئی شراکت قبول نہیں کر سکتے۔ یہ گریٹر اسرائیل کا دارالخلافہ ہے۔ نیز ہمیں ہر قیمت پر ہیکل سلیمانی بنانا ہے۔ اور یہ کہ ہم اسرائیل میں کسی عرب کو نہیں رہنے دیں گے خواہ انہیں ختم کرنا پڑے، یا پھر انہیں شرق اردن میں دھکیل دو۔ اسرائیلی حکومت پر انتہا پسند یہودیوں کے اثر و رسوخ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب شیرون نے اپنی کابینہ میں ایک ایسے وزیر کو شامل کیا ہے جو مکمل داڑھی والا ہے۔ اس کا نام ایفی ایبک ایتام ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ فلسطینیوں کو صحرائے سینا میں دھکیل دیا جائے اور مصر سے کہا جائے کہ وہاں ان کے لیے فلسطینی ریاست قائم کر دے۔ یہ ہے ایک انتہا! لیکن وہاں بھی ایک نرم اور سیکولر نقطہ نظر ہے۔ سیکولر یہودی کہتے ہیں کہ گریٹر اسرائیل قائم کر کے جو خون خرابہ اور فساد ہو گا، اس سے کیا فائدہ۔ اس چھوٹے سے اسرائیل کے تحفظ کے لیے ہمیں کتنی جانیں دینی پڑ رہی ہیں، اگر ہم دس ہزار فلسطینی مسلمانوں کو مارتے ہیں تو سو، دو سو ہمارے بھی مرتے ہیں۔

ہم تو ہیں ہی کل ایک کروڑ جب کہ وہ ۳۰ کروڑ ہیں۔ اگر سارے مسلمان ملا لیں تو وہ ۱۵۰ کروڑ ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ ہم صلح کر لیں، آخر ہم کزن ہیں، وہ بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہیں ہم بھی ابراہیمؑ اولاد ہیں، اور جیسے دنیا میں بہت سے معاشی یونٹ بن رہے ہیں، عرب اور اسرائیل مل کر ایک یونٹ بن جائے۔ عربوں کے پاس پیسہ، لیبر اور تیل بہت ہے جبکہ ہمارے پاس مہارت، مینجمنٹ اور ایگزیکٹو صلاحیت ہے۔ لہٰذا ہم مل کر بہت ترقی کر سکتے ہیں۔ پھر اس طرح ملائی ہم کھائیں گے، چھاچھ ان کو دے دیں گے۔ یہ ان کی بائیں بازو کی جماعتوں کا نقطہ نظر ہے جن کا نمائندہ شمعون پیریز اس وقت وزیر خارجہ ہے۔ شیرون جو کچھ کر رہا ہے، شمعن پیریز اسے پسند نہیں کرتا۔ لیکن شیرون نے یہ

انتظام کر لیا ہے کہ اگر وہ پارٹی اس کا ساتھ چھوڑ بھی جائے تو اس نے اب اپنے ساتھ Ultra nationalist parties شامل کر لی ہیں۔ انہی میں سے یہ ایک وزیر ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ایک امریکی صحافی نے اس مذہبی یہودی وزیر سے جب یہ کہا کہ یہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو تو اس نے تنگ کر جواب دیا: "تم نے افغانستان میں کیا کیا، آج ہمیں سبق پڑھانے آئے ہو۔ ہم پاول سے صاف کہہ دیں گے (یہ پاول کے اسرائیل جانے سے پہلے کی بات ہے) کہ دنیا کے اندر یہ دہرا معیار ختم کرو۔ افغانستان میں کتنے شہری تمہاری وحشیانہ بمباری سے مر رہے ہیں اور اب ہمیں آکر سبق پڑھاتے ہو"۔ دراصل اسرائیل کو پتہ ہے کہ امریکہ ہمارے شکنجے میں ہے، وہ ہل نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ شمعون پیریز نے شیرون سے کہا تھا، دیکھو امریکہ ناراض ہو جائے گا! شیرون نے جواباً کہا، تم کیا بار بار مجھے امریکہ کا نام لے کر ڈرا رہے ہو؟ امریکہ ہمارے شکنجے میں ہے۔ اس کے یہ الفاظ ریکارڈ پر ہیں۔ اسی طرح ایک بار نتن یاہو نے کہا تھا کہ میں واشنگٹن کے اندر آگ لگوا دوں گا اور ۱۱ ستمبر کو اس نے سچ کر دکھایا۔

اب صلح کی راہ میں حائل دو بڑی بڑی رکاوٹیں نوٹ کر لیجیے۔ ایک تو قبۃ الصخرہ کا مسئلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ۳۰، ۳۵ لاکھ پناہ گزین ہیں جن کو واپس لینے کے لیے اسرائیل بالکل تیار نہیں۔ اس لیے کہ اسرائیل ہماری ریاست بہاولپور سے بھی چھوٹا ملک ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۲۰۰ میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۸۰ میل ہے۔ بعض مقامات پر تو اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ اس کشتی کے اندر اگر ۳۵ لاکھ افراد مزید آجائیں تو کشتی ڈوب جائے گی۔ لہٰذا وہ ان پناہ گزینوں کو واپس لینے کو تیار نہیں۔ اس وقت صلح میں یہ دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ آخری آفر جو یہود کی طرف سے آسکتی تھی وہ ایہود بارک کے زمانے میں کلنٹن کے زیر اثر آگئی تھی۔ ایہود بارک سیکولر یہودی تھا، اس نے آفر کی تھی کہ فلسطینی ریاست ہمیں منظور ہے، یروشلم کی تقسیم بھی ہم قبول کرتے ہیں، یعنی مشرقی یروشلم اپنے پاس رکھو، اس کے جتنے حصے میں مسجد اقصیٰ بنی ہوئی ہے وہ تم رکھ لو لیکن اوپر کا شمالی حصہ جہاں گنبد ہے وہ ہمیں دے دو تاکہ ہم وہاں اپنا ہیکل بنا لیں۔ باقی یہ کہ فلسطینی مہاجرین کو مسلمان ممالک اپنے اندر جذب کر کے انہیں اپنے ملک کی شہریت دیں۔ میرے نزدیک اس سے آگے کوئی یہودی سربراہ نہیں جا سکتا۔ عرفات نے اس تجویز کو رد کر دیا تھا، جس پر امریکہ چیختا رہا کہ اس نے یہ موقع ضائع کر دیا۔ لیکن عرفات نے ہی نہیں، شیرون نے بھی اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔ شیرون نے اس وقت جو معاملہ شروع کیا تھا اسی کے نتیجے میں یہ حالیہ فساد کھڑا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ نیوز ویک کے تازہ پرچے نے شیرون پر بہت شدت کے ساتھ تنقید کی ہے۔ اس میں ایک مضمون "A blue print for peace" شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ پورا ٹیمپل ماؤنٹ مسلمانوں کو دے دیا جائے البتہ West Wall اور اس کے سامنے کا میدان یہودیوں کے پاس ہو تاکہ وہ اپنا ٹیمپل تعمیر کر سکیں۔ اگر یہ واقعتاً ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی بات ہو گی۔ لیکن میرے نزدیک یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ نہ ہی مسلمان اس سے کبھی دستبردار ہو سکتے ہیں اور نہ یہودی اس کی جگہ تیسرے ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے باز رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ بڑی جنگ ہو کر رہے گی جس کی خبریں احادیث میں دی گئی ہیں۔ اس موقع پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدی کی مدد کے لیے فوجیں افغانستان اور پاکستان ہی سے روانہ ہوں گی۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ پاکستان کے اس رول کو مضبوط کرنے کے لیے دین کے تقاضوں کو پورا کرے اور مملکت خداداد پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے۔

ڈاکٹر محمد مشتاق[59]

سوشلسٹ روس کے زوال کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے کئی دیسی سوشلسٹ مشرف بہ امریکا ہو کر "لبرل" کہلانے لگے۔ دیسی سوشلسٹ کم از کم فلسطینیوں کی آزادی کے حق میں اور اسرائیل و امریکا کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ تاہم کایاپلٹ کے بعد "شوقیہ لبرل" بننے والے تو خیر و شر کا فرق ہی بھول گئے ہیں۔

ان شوقیہ لبرلز کی دیکھا دیکھی "اعتدال" اور "داعیانہ اسلوب" کے مدعی مولوی صاحبان بھی اسرائیل اور امریکا کے خلاف بولنے والوں کو کوسنے دینے لگے ہیں۔ ایک عام مغالطہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلسطین اور القدس کی سرزمین یہود کی ہے، اس لیے القدس کو اسرائیل کا دارالحکومت بنائے جانے پر اعتراض غلط ہے۔ یہ دعویٰ تسلیم کرنے کے لیے دو کام کرنے پڑتے ہیں:

---

[59] https://www.badbaan.com/8969/ فلسطین اور القدس پر یہود کا دعویٰ غلط، لیکن کیسے؟

ایک، اس سرزمین کی ابدی ملکیت کے متعلق یہود کا دعویٰ تسلیم کیا جائے؛ اور دو، معاصر بین الاقوامی قانون کے تمام اصول نظر انداز کیے جائیں۔

پہلی بات اس وقت قطعی غیر متعلق ہے۔ بعض مسلمان اہلِ علم نے یہود کے "حقِ تولیت" کے لیے قرآن وحدیث سے استدلال کی روش بھی اختیار کی ہے۔ اس استدلال کی صحت یا عدمِ صحت پر بحث بھی اس وقت قطعی غیر متعلق ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ معاصر بین الاقوامی قانون یہود کا "حقِ ملکیت" تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟

پہلی جنگِ عظیم تک بین الاقوامی قانون کی رو سے کسی سرزمین پر کسی ریاست کا حقِ ملکیت تسلیم کرنے کے جو جائز طریقے تھے، ان میں ایک طریقہ "فتح (Conquest)" تھا بشرطیکہ اس کے بعد فاتح ریاست اس مفتوحہ علاقے کا الحاق (Annexation) کر لیتی۔

اسی اصول پر 1857ء کے بعد سے ہندوستان کو برطانوی بادشاہت کا حصہ قرار دیا گیا اور اسے "برطانوی ہند (British India)" کہا جانے لگا اور برطانیہ کی ملکہ ہندوستان کی بھی ملکہ ہو گئیں۔

یہ اصول پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک بین الاقوامی قانون میں تسلیم کیا گیا۔ تاہم 1928ء میں امریکا اور فرانس نے آپس میں معاہدہ کر کے یہ اصول طے کیا کہ جنگ کے ذریعے علاقے فتح کرنا ناجائز ہے۔ کچھ ہی عرصے میں دیگر ریاستوں نے بھی اس معاہدے کو، اور اس کے ذریعے طے شدہ اصول کو، تسلیم کر لیا۔ چنانچہ 1928ء کے معاہدۂ پیرس کے بعد سے "فتح" کے ذریعے کسی علاقے کے "الحاق" کو بین الاقوامی قانون تسلیم نہیں کرتا۔

اب "فاتح" ریاست کو "قابض طاقت (Occupying Power)" اور مفتوحہ علاقے کو "مقبوضہ علاقہ (Occupied Territory)" کہا جاتا ہے اور اصول یہ طے کیا گیا ہے کہ جب تک قبضہ ختم نہیں ہو جاتا، حالتِ جنگ برقرار رہتی ہے۔

اسی وجہ سے یہ اصول بھی مانا گیا ہے کہ قابض طاقت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مقبوضہ علاقے کی آبادی یا جغرافیے میں کوئی مستقل اور دوررس تبدیلی لائے کیونکہ جلد یا بدیر اس قابض طاقت کو اس مقبوضہ علاقے سے نکلنا پڑے گا۔

تاریخی طور پر مسلم ہے کہ یہود کو رومیوں نے پہلی صدی عیسوی میں فلسطین سے نکال دیا تھا اور اس وقت کے بین الاقوامی عرف اور قانون کے مطابق اس سرزمین پر فاتح طاقت، یعنی رومی سلطنت، کی ملکیت قائم ہو گئی۔

ساتویں صدی عیسوی میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اس کی ملکیت مسلمانوں کو منتقل ہوئی اور یہ ملکیت بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک برقرار رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس علاقے پر برطانیہ کا قبضہ ہوا لیکن برطانیہ نے اس پر اپنا حقِ ملکیت قائم نہیں کیا بلکہ اسے "امانت" کے طور پر قبول کیا۔

جنگ کے بعد وجود میں لائی جانے والی تنظیم "مجلسِ اقوام (League of Nations)" نے اس علاقے کو ترقی دینے اور یہاں کے لوگوں کو اپنی حکومت سنبھالنے کے لائق بنانے، بہ الفاظِ دیگر "مہذب بنانے"، کی ذمہ داری (Mandate) برطانیہ کو دے دی۔ 1948ء تک یہ علاقہ برطانیہ کے پاس امانت کے طور پر ہی رہا اور برطانیہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی بلکہ اس امانت میں بھرپور خیانت بھی کی۔

1948ء میں برطانیہ نے مجلسِ اقوام کی وارث تنظیم، یعنی اقوامِ متحدہ کو کہا کہ وہ مزید اس امانت کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ اقوامِ متحدہ نے یہ علاقہ برطانیہ سے واپس لے کر اسے یہود اور عربوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اقوامِ متحدہ کو اس تقسیم کا اختیار تھا یا نہیں اور کیا یہ تقسیم منصفانہ اور جائز تھی یا نہیں؟ اس پر تفصیلی بحث کی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر اس بحث کو نظر انداز بھی کیا جائے تو یہ دو حقیقتیں بہرحال مسلم ہیں:

ایک یہ کہ 1948ء میں جس سرزمین پر "اسرائیل" کی ریاست قائم ہوئی اس میں القدس شامل نہیں تھا؛

دوسری یہ کہ القدس سمیت جن علاقوں پر اسرائیل نے 1967ء کی جنگ میں قبضہ کیا وہ اسرائیل کا حصہ نہیں، بلکہ اس کے "مقبوضہ علاقے" ہیں اور 1928ء کے معاہدۂ پیرس کے بعد سے بین الاقوامی قانون مقبوضہ علاقے پر قابض طاقت کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔

چنانچہ اسرائیل القدس اور دیگر مقبوضہ علاقوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لاسکتا؛ نہ وہ وہاں آبادکاری کرسکتا ہے، نہ ہی وہاں ایسی دیوار تعمیر کرسکتا ہے جو اس علاقے کو مستقل طور پر تقسیم کردے۔ یہ بات 2003ء میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف (International Court of Justice) نے اپنے فیصلے میں تفصیلی طور پر واضح کی ہے۔ اس وجہ سے بین الاقوامی قانون کی رو سے قطعی طور پر ناجائز ہے کہ القدس یا مقبوضہ علاقے کے کسی بھی حصے کو اسرائیل کا دارالحکومت بنایا جائے۔

کاش "شوقیہ لبرلز" کو کوئی فیض اور جالب کے اشعار ہی یاد دلادے۔ یہ ٹھیک ہوجائیں تو "داعیانہ اسلوب" کے مدعی مولوی خود بخود سدھر جائیں گے۔

صیہونی تحریک اور مسلمانانِ پاک و ہند

ابھی پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ "اعلانِ بالفور" کو جاری و نافذ ہوئے ایک سال ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کی غم خوار، جو اسلامیانِ عالم کا بھی دم بھرتی تھی، صرف "آل انڈیا مسلم لیگ" تھی جس کے قیام کو بارہ سال ہو رہے تھے۔ ابھی اس جماعت نے مسلمانوں کو اپنی طرف نہیں کھینچا تھا۔ صرف دو ماہ قبل 30 اکتوبر کو ترکی نے ہتھیار ڈال کر بیت المقدس کی چابی انگریزوں کے حوالے کر دی تھی۔ 30 دسمبر 1918ء کو مسلم لیگ کا گیارہواں سالانہ اجلاس شیر بنگال اے کے فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خان، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبدالباری، مولانا احمد سعید، مولوی ابوالقاسم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، عبدالرحمٰن صدیقی، نواب ذوالفقار جنگ کے علاوہ بعض کانگریسی رہنما مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ، مسز اینی بسنت، وجے رگھو چتیار، مسٹر شاستری، مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ ہم بھی شریک تھے۔

اس اجلاس میں "خلافت" کے مسئلے پر مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اپنے خطبے میں فرمایا: "یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ 1517ء میں ترک عثمانی سلطان سلیم الاول نے مصر فتح کر کے خلافتِ عباسیہ کے اخری خلیفہ المتوکل الثالث نے، مسلمانوں کی رضامندی سے، تبرکاتِ خلافت (مثلاً آنحضور ﷺ کی تلوار، علم اور عبا) ترکی کے سلطان سلیم اول کے سپرد کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ سلطان سلیم خلافتِ عباسیہ کے آخری خلیفہ کو ہمراہ لے کر تبرکاتِ خلافت استنبول لے آیا۔

اس دن سے آج تک خلفائے عثمانیہ کو خلیفۃ المسلمین، سلطان السلام اور خادم الحرمین الشریفین کے القابات کا شرف حاصل رہا ہے اور اسلامیان عالم انہیں رسول اللہ کا جانشین اور روحانی امام سمجھتے رہے ہیں۔ صرف مکہ اور مدینہ ہی میں نہیں، بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، ان کی کامیابی و کامرانی اور فضیلت کے لیے ہر خطبۂ جمعہ میں اور عیدین کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

شریف برکات آف مکہ بھی سلطان سلیم کے فرمان کے بموجب انہیں خلیفہ تسلیم کرتا ہے اور اس کے حکم سے مساجد میں خطبوں ک دوران خلیفہ عثمانی کا نام لے کر دعا ک یجاتی ہے۔ کسی بھی شریف مکہ نے آج تک ترکی کے حکمرانوں کے اختیار و اقتدار پر اعتراض نہیں کیا۔ حتیٰ کہ موجودہ شریف حسین بھی سلطان ترکی کو خلیفۃ المسلمین سمجھتا ہے اور ان کی اطاعت کو تسلیم کرتا ہے۔

لیکن موجودہ جنگ کے دوران میں ذاتی مفادات اور خود غرضانہ خواہشات نے شریف حسین کو ایسا مغلوب کیا کہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کا پھریرا لہرانے لگے، حالانکہ وہ علی الاعلان انہی خلیفۃ المسلمین تسلیم کر چکے ہیں۔ اپنے اس اقدام سے انہوں نے سیاسی اخلاق ہی کی بے حرمتی نہیں کی، بلکہ اسلامی عقائد اور دینی تعلیمات کی رو سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے واضح احکام کی بھی کھلم کھلا خلاف ورزی کی"۔

اس اجلاس میں خلافتِ عثمانیہ اور اسلامیانِ عالم کے حق میں ایک پرزور قرارداد بھی منظور کی گئی۔ 1918ء سے 1938ء میں رائل کمیشن کی رپورٹ "تقسیم فلسطین" آنے تک صہیونی تحریک نے ترقی کے کئی مراحل کامیابی سے طے کر لیے تھے۔ رائل کمیشن کی رپورٹ پر 3 جولائی 1938ء کو علامہ اقبال نے ایک بیان جاری کیا۔ اس بیان کو علامہ صاحب کی زندگی کے آخری سال کی اہم ترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اصل بیان انگریزی میں لکھا گیا تھا، لیکن جلسۂ عام میں غلام رسول خان نے اس کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا:

''میں آپ لوگوں کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے، میں اس کو اسی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں جس شدت سے ہر وہ شخص اسے محسوس کرتا ہے جسے مشرق قریب کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرنے پایا اور انگریز قوم کو بیدار کر کے اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان وعدوں کو پورا کرے جو اس نے انگلستان کے نام پر عربوں کے ساتھ کیے تھے۔ بہر حال یہ امر کسی حد تک موجب اطمینان ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس موضوع پر حال ہی میں جو بحث ہوئی ہے، اس میں تقسیم فلسطین کے مسئلے کا کوئی حتمی اور دوٹوک فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانانِ عالم کو چاہیے کہ وہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کریں کہ برطانیہ کے مدبرین جس عقدے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کا تعلق صرف فلسطین تک محدود نہیں، بلکہ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے عالم اسلام کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔''

اگر تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ خالصتاً اور کلیتاً مسلمانوں کا ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ بیت المقدس میں تشریف لے گئے تھے اور اس واقعے پر بھی آج تیرہ سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے، تو ان کی تشریف آوری سے سے مدتوں پہلے یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہودیوں کو فلسطین سے زبردستی نہیں نکالا گیا تھا، بلکہ جیسا کہ پروفیسر ہاکنگز کی رائے ہے، وہ اپنی خوشی سے دوسرے ممالک میں چلے گئے تھے اور ان کے صحائف مقدس کا بیشتر حصہ بھی فلسطین سے باہر ہی قلم بند کیا گیا تھا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ فلسطین کا سوال کبھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں بنا تھا۔ دورِ حاضر کی تاریخی روشنی میں تو راہب پیٹر کا وجود بھی مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا ہے۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ صلیبی جنگوں کی غرض وغایت یہ تھی کہ فلسطین کو مسیحی مسئلہ بنایا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صلاح الدین ایوبی کی فتوحات نے ایسی تمام کوششوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میری نگاہ میں فلسطین کا مسئلہ سراسر اور کلیتہ، مسلمانوں کا ہے۔

مشرق قریب کے مسلمانوں کے بارے میں برطانوی شہنشاہیت کے مذموم ارادوں کو جس بری طرح رائل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے، اس کی مثال، پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلیت یہ کہ مسلمانوں کی اس مقدس اور مذہبی سرزمین پر اپنا مستقل تسلط قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لیے ایک نیا ٹھکانہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ ایک اقدام ایک خطرناک تجربہ ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے بھی اس کو خطرناک تجربے ہی سے تعبیر کیا ہے۔ بحر روم میں برطانیہ کو جو مشکلات درپیش ہیں، یہ تجربہ اس کو رفع نہیں کر سکے گا، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان مشکلات کو رفع کرنے کی بجائے یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لیے بہت سے نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔

عربوں کو جس جس طریقے سے تنگ کر کے اپنی ارضِ مقدس (جس پر حضرت عمرؓ کی مسجد قائم ہے) فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، اس میں ایک طرف تو مارشل لاء نافذ کر دینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری طرف عربوں کی قومی فیاضی اور ان کی روایتی مہمان نوازی کے جذبات لطیف کو برانگیختہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ عمل گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ برطانوی تدبر کا اب دیوالیہ نکل چکا ہے۔ یہودیوں کو زرخیز اراضی کی پیشکش کر کے اور عربوں کو پتھریلی بنجر زمین کے ساتھ کچھ نقدی دے کر راضی کرنے کی کوشش قطعاً کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنیٰ درجے کی حقیر سودابازی ہے، جو یقیناً اس عظیم الشان قوم کے لیے موجب ننگ اور باعث شرم ہے جس کے نام پر عربوں سے آزادی کا وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ ان کے درمیان ایک مشترکہ ومتحدہ وفاق قائم کر دیا جائے گا۔

میں اس مختصر سے بیان میں رائل کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں، تاہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانۂ حال کی تاریخ سے بعض بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہییں۔ تجربے نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ مشرق قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی بقا صرف اس راز میں مضمر ہے کہ ترکوں اور عربوں کا اتحاد جلد از جلد قائم ہو جانا چاہیے۔ مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کو عالم اسلام سے جدا کر دینے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے اس قسم کی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں کہ ترک اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا گیا ہو گا۔ اس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پروپیگنڈے کا شکار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی اصولِ قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔

یہ عرب ہی تھے جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا، جس نے آگے چل کر ایشیا کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے عربوں کو چاہیے کہ اپنے قومی مسائل پر غور وفکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں، کیونکہ موجودہ حالات میں ان بادشاہوں کی حیثیت سے ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ایمان وضمیر کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیت و غیرت کا امتحان ہے، خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب۔ منصبِ خلافت کی تنسیخ کے بعد عالم اسلام کے لیے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے، جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے، اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اس اینگلو فرانیسی ادارے سے جسے غلطی سے "لیگ آف نیشنز" کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بد گمان و برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمیعت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔"

20 جولائی 1937ء کو علامہ اقبال نے اسی مضمون کا ایک زور دار خط انگلستان کی نیشنل لیگ کی صدر مس فار کو ہرسن کے نام لکھا، جس کے یہ نکات قابلِ غور ہیں:

"نیشنل لیگ کو چاہیے کہ بیک آواز اس ظلم و طغیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور برطانوی باشندگان کو سمجھائے کہ عربوں سے ناانصافی نہ کریں، بلکہ ان وعدوں کا ایفاء کریں جو گزشتہ جنگِ عظیم میں برطانیہ کے حکمرانوں نے برطانوی عوام کے نام پر عربوں سے کیے تھے۔ حقیقی طاقت کا سرچشمہ ہوش و خرد اور عقل مندی ہے، اور جب طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے تو تباہی سے ہمکنار ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ فلسطین برطانیہ کی ملکیت نہیں۔ برطانیہ تو محض مجلس اقوام دراصل ایک اینگلو فرانیسی ادارہ ہے جس کا مقصد صرف اسلامی ممالک کے حصے بخرے کر کے انہیں کمزور سے کمزور تر کر دینا ہے۔ فلسطین یہودیوں کا ملک بھی نہیں، کیونکہ یہودی تو عربوں کی آمد سے بہت پہلے اپنی مرضی سے فلسطین چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ صیہونی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ صیہونی تحریک کا ڈھونگ اس لیے نہیں کھڑا کیا گیا تھا کہ یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن درکار ہے بلکہ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ بحیرۂ روم میں برطانوی سامراج کے لیے ایک نیا اڈہ قائم کیا جائے۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اور تاریخ ساز اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنو میں منعقد ہوا۔ قائد اعظم نے فلسطین کے سلسلے میں حکومتِ برطانیہ کی پالیسی پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"حکومتِ برطانیہ نے عربوں کے ساتھ بہت بڑی دغابازی کی ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے جنگِ عظیم کے بعد اپنے اعلان میں یہ وعدہ کیا تھا کہ عربوں کو مکمل آزادی عطا کی جائے گی اور ایک متحدہ عرب کنفیڈریشن بنایا جائے گا، لیکن عربوں سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے بعد "اعلان بالفور" کے ذریعے ان پر انتدابی تسلط جمایا گیا۔ اب برطانیہ فلسطین کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر "رائل کمیشن" کی سفارشات پر عمل کیا گیا تو عربوں کے جائز حقوق اور حوصلوں کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔ لیگ آف نیشنز نے ابھی تک رائل کمیشن کے منصوبے کو منظور نہیں کیا ہے اور خدا کرے، آئندہ بھی منظور نہ کرے۔ اگر برطانیہ اپنے اصلی اعلان اور جنگ عظیم کے بعد کے عہد و پیمان پر قائم نہ رہے گا تو مسلمانانِ ہند کیا، بلکہ ساری دنیا کے مسلمان بالاتفاق حکومتِ برطانیہ کو یہ آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنی قبر کھودے گی۔"

لکھنو کے اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک قرار داد بھی منظور کی تھی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"مسلمانانِ ہند کی جانب سے آل انڈیا مسلم لیگ اعلان کرتی ہے کہ فلسطین کے رائل کمیشن کی سفارشات اور ان سے متعلق وزیر نو آبادیات نے پارلیمنٹ میں جو بیان دیا ہے، وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے متصادم و متخالف ہے۔ مسلم لیگ اس کو مد نظر رکھ کر یہ مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت اس پالیسی سے فوراً دستبردار ہو جائے۔۔۔ آل انڈیا مسلم لیگ حکومت ہند کو اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ لیک آف نیشنز کی اسمبلی کے ہندوستانی نمائندوں کو ہدایت کرے کہ وہ عربوں کے مذہبی اور شہری حقوق کے تحفظ کے پیش نظر فلسطین سے غیر ملکی اقتدار اٹھائے جانے کا مطالبہ کریں اور ہر اس فیصلے سے الگ تھلگ رہیں جس سے اس اقتدار کی بقا کا احتمال ہو اور جو فلسطینی عربوں کو اس اصول حق سے محروم کر دے جس کی رو سے وہ بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے بہترین طرزِ حکومت منتخب کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے فرماں رواؤں سے آل انڈیا مسلم لیگ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنا زبردست اثر اور اپنی کوششیں جاری رکھیں کہ ارضِ مقدس پر غیر مسلم تسلط کی پامالی اور عربوں کو اس برطانوی سامراج کی غلامی سے بچائیں جسے یہودیوں کے سرمائے کی مدد حاصل ہے۔ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم فلسطین کے زیر قیادت جو اعلیٰ مسلم کونسل اور سپریم عرب کمیٹی قائم ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ ان پر کامل اطمینان اور اعتماد کا اظہار کرتی ہے

اور فلسطین کی مقامی حکومتوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ اس ظلم و استبداد کی پالیسی کو جس کی حمایت رائل کمیشن نے بظاہر قیام امن اور انتظام کے لیے لیکن درحقیقت عربوں کے مفادات کو تقسیم فلسطین کے ذریعے نقصان پہنچانے کی غرض سے اختیار کی ہے، جاری رکھ کر مسلمانانِ عالم کے لیے جذبۂ خفگی کو مزید تقویت نہ دیں۔۔۔ فلسطین کانفرنس منعقدہ 25 ستمبر 1937ء میں وفد کے جو ارکان نامزد کیے گئے ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ ان پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور فلسطینی عربوں کے ہر حامی اور دوست سے اپیل کرتی ہے کہ ان کی شکایات رفع کرنے کے لیے متحدہ صدا بلند کریں۔ اگر حکومتِ برطانیہ نے اپنی موجودہ یہود نواز پالیسی کو نہ بدلا تو آل انڈیا مسلم لیگ اسے متنبہ کرتی ہے کہ مسلمانانِ ہند تمام اسلامیانِ عالم کے ساتھ مل کر برطانیہ کو اسلام کا دشمن تصور کریں گے اور اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر تمام ضروری کاروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔"

قائداعظمؒ کی تحریک پر 26 اگست 1938ء کو "یوم فلسطین" ہندوستان کے ہر شہر اور قصبے میں منایا گیا۔ قاہرہ میں 7 اکتوبر 1938ء کو مصری کمیٹی کی دعوت پر عرب و مسلم ممالک کی ایک کانگریس منعقد ہوئی، جس میں شرکت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے پانچ رکنی وفد بھیجا گیا جس میں چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی اور مولانا مظہر الدین شامل تھے۔ اس وفد نے حکومتِ برطانیہ کے نام ایک طویل میمورینڈم جاری کیا، جس میں حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عربوں کی آزادی مقدس مقامات کے متعلق اپنے وعدے پورے کرے۔ فلسطین میں یہودیوں کی بے حد و حساب "درآمد" سے مسلمانوں کو یہ شبہ ہو چلا ہے کہ برطانیہ عربوں کی قومی ترقی مسدود کرنا چاہتا ہے۔ "اعلان بالفور" میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے یہ ظاہر ہو کہ فلسطین میں یہودیوں کی الگ ریاست قائم کی جائے۔ اب انتداب کی مدت میں توسیع کرنے سے مسلمانوں کے دلوں میں موجود شکوک و شبہات زیادہ ہو رہے ہیں۔

سندھ مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ 18-19 اکتوبر 1938ء بمقام کراچی میں قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا: "برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں طاقت و قوت ہے"۔ انہوں نے پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے چھبیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ 26 دسمبر 1938ء میں فلسطینی سرفروشوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "فلسطین کے سرفروشوں کو باغی کہا جاتا ہے اور ان کے ساتھ باغیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ غازی اور شہید ہیں سرمایہ دار یہودیوں کے مفادات کی خاطر عربوں کے ساتھ بے انصافی کی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس معاملے میں خوش نہیں رہ سکتے اور وہ اپنے بھائیوں کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔"

مارچ 1940ء میں لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں قائداعظمؒ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا: "ہمیں بتایا جاتا ہے کہ عربوں کے معقول قومی مطالبات کو پورا کرنے کی مخلصانہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جناب والا! ہم مخلصانہ کوششوں، سنجیدہ کوششوں، بہترین کوششوں سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت برطانیہ فی الحقیقت اور عملی طور پر فلسطین میں عربوں کے مطالبات کو پورا کرے۔"

اس اجلاس میں جناب عبدالرحمٰن صدیقی نے فلسطین کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی، جس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ ابھی تک فلسطینی عربوں سے کوئی آبرومندانہ تصفیہ نہیں کیا گیا۔ نیز حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا کہ ارض مقدس میں بھاری انگریز فوج کی موجودگی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے، عربوں کو بلاوجہ مرعوب نہ کیا جائے اور انہیں اطاعت پر مجبور نہ کیا جائے۔

اپریل 1943ء میں دہلی کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس میں نواب زادہ لیاقت علی خان کی تحریک پر مسئلہ فلسطین پر ایک اور قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی: "آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس امریکہ میں نئے صیہونی پروپیگنڈے پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے جس کے تحت حکومتِ امریکا پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کے داخلے پر جو پابندیاں عائد ہیں، وہ فوراً ہٹالی جائیں اور فلسطین کو ایک "صیہونی ریاست" بنانے کی مضبوط پالیسی اختیار کرے۔ اس اجلاس کی یہ پختہ رائے ہے کہ نئے صیہونی اقدام کا مقصد فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت بنانے کے لیے، جنگ کے نتیجے میں پناہ گزیں ہو جانے والے تمام یہودیوں کو ہنگامی حالت کے تحت اور یورپ میں یہودیوں کے قتل عام کے باعث فلسطین میں مستقل آباد کرنا ہے۔ یہ اجلاس اس نئی صیہونی چال کی سخت مذمت کرتا ہے، کیونکہ یہ عرب اور اسلامی دنیا کے مفادات کے خلاف ہے۔ یہ اقدام ایسے وقت کیا جا رہا ہے جبکہ فلسطین کی اعلیٰ عرب کمیٹی اور مٹھی بھر عرب قوم پرست انتہائی منظم یہود اور ان کے سرمائے کے خلاف بالکل بے بس اور لاچار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اجلاس اپنے سابقہ مطالبات کی توثیق کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ فلسطین و شام کی آزادی کا وعدہ پورا کیا جائے۔ اگر حکومتِ برطانیہ عربوں کے قومی مفادات کے خلاف کوئی اقدام کرے گی تو اس سے تمام اسلامی دنیا میں غصہ و نفرت کی لہر پیدا ہو گی"۔

ایسی ہی ایک قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کے اکتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ 1943ء کراچی میں بھی منظور کی گئی۔ 8 نومبر 1945ء کو قائداعظم نے بمبئی کے ایک بڑے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فلسطین کے بارے میں حکومتِ برطانیہ کی پالیسی پر زبردست تنقید کی۔ قائداعظم نے شاید ہی کبھی اتنی غصہ ور اور غضبناک تقریر کی ہو۔ آپ

نے فرمایا: "فلسطین ایک تاریک اور نازک دور سے گزر رہا ہے۔ جنگِ عظیم کے ادائل میں عرب ملکوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر تم ہماری مدد کرو گے تو جنگ کے بعد ان ممالک میں آزاد و خود مختار حکومتیں قائم کی جائیں گی۔ ان ممالک کے لوگوں نے اپنا خون بہا کر برطانیہ کی مدد کی۔ چونکہ مسلمانوں کے وعدے کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی، وہ اپنی جان دے دیتے ہیں مگر الفاظ نہیں دیتے، اس لیے انہوں نے برطانیہ کی مدد کی۔ اور جب برطانیہ نے فتح کا منہ دیکھ لیا تو ان ممالک نے حسبِ وعدہ آزادی کا مطالبہ کیا، مگر وہ شرمندۂ وفا نہ ہوا۔ عرب ممالک کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ کچھ فرانس کو دے دیے گئے اور کچھ انگریزوں نے سنبھالے۔ 1938ء میں عربوں سے کہا گیا کہ ہمیں فلسطین میں ان یہودیوں کی کچھ تعداد آباد کر لینے دو جنہیں ہٹلر اور نازیوں نے دھکے دے کر جرمنی سے نکال دیا ہے، اور یہ درخواست ان سرمایہ دار یہودیوں کی وجہ سے تھی جو برطانیہ اور امریکہ میں آباد تھے۔ آخر عربوں اور برطانیہ و امریکہ میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مارچ 1945ء تک یہودیوں کی ایک خاص تعداد کو فلسطین میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ 31 مارچ 1945ء کو اس سمجھوتے کی میعاد ختم ہو گئی۔ لیکن اٹلی و جرمنی پر فتح کے بعد صدر امریکہ ٹرومین نے برطانیہ سے کہا کہ سمجھوتے کی میعاد بڑھا دی جائے تاکہ فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ بند نہ ہو۔ ادھر امریکہ زور دیتا، ادھر یہودی زبردستی فلسطین میں آتے رہے۔ آخر خطرے کے پیشِ نظر حکومت برطانیہ نے یہودیوں کے داخلے پر تھوڑی سی پابندی لگا دی۔ میں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مفتی اعظم فلسطین کی رہائی کے لیے حکومت برطانیہ کو لکھا۔ جواب ملا کہ وہ باغی ہے، اس لیے آپ کی درخواست قابلِ عمل نہیں میں پوچھتا ہوں، یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے فلسطین کا چھوٹا سا علاقہ ہی کیوں منتخب کیا گیا ہے! انہیں امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں کیوں آباد نہیں کیا جاتا" میں صدر ٹرومین سے پوچھتا ہوں وہ یہودیوں کو فلسطین ہی میں کیوں آباد کرانا چاہتے ہیں۔ امریکی حکومت کے عربوں سے کیے ہوئے وعدے کہاں گئے۔ شاید انہیں کمزور اور بے بس سمجھ کر دبایا جا رہا ہے۔ مگر ٹرومین کا یہ فعل وعدہ خلافی اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ وہ خود اور حکومتِ امریکہ مجرم ہیں جو اپنی طاقت کے بل پر انصاف کا خون کر رہے ہیں۔ مجرموں کے ناپاک ارادے کبھی پورے نہ ہوں گے۔ ہم مسلمانانِ ہند اعرابِ فلسطین کے ساتھ ہیں۔ ہم اس مقدس جنگ میں اپنا مال اور اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کو کان کھول کر سن لینا چاہیے کہ تمام اسلامی دنیا اپنی جانیں دے کر ان سے ٹکرا جائے گی اور فرعونی دماغ کو پاش پاش کر دے گی۔"

مرکزی اسمبلی کے الیکشن کے بعد 13 فروری 1942ء کو روزنامہ "نیویارک ٹائمز" کے نمائندے کو قائداعظم نے ایک انٹرویو دیا، جس میں فلسطین کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: عربوں کی امداد کے لیے مسلمان وہ سب کچھ کر دکھائیں گے جو ان کے بس میں ہو گا۔ اس سلسلے میں مسلمان کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، کیونکہ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ فلسطین مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، ہم کر گزریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو تشدد سے بھی منہ نہیں موڑیں گے۔"

دو ماہ بعد 7 تا 9 اپریل 1942ء میں دہلی میں ہندوستان بھر سے مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے مسلم لیگی ارکان کا ایک کنونشن منعقد ہوا۔ کنونشن کے اختتامی اجلاس کے بعد 10 اپریل کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں تین گھنٹے تک فلسطین، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ کے مسائل پر بحث مباحثے کے بعد قرار دادیں منظور ہوئی۔ اس موقع پر مسئلہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا: "جس دن سے برطانیہ کو فلسطین کا انتداب دیا گیا ہے، یہ ایک تاریک تاریخ بن گئی ہے جو تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کس قدر قابلِ مذمت بات ہے کہ برطانیہ جیسی عظیم طاقت بھی امریکی یہودیوں کے دباؤ میں آ گئی ہے۔"

یکم مئی 1942ء کو اینگلو امریکن کمیٹی کی سفارشات کے متعلق ایک بیان میں قائداعظم نے فرمایا: "اینگلو امریکن کمیٹی کی سفارشات کا جو خلاصہ اخبارات میں شائع ہوا ہے، اسے پڑھ کر میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ برطانوی وعدہ خلافیوں کی بدترین مثال ہے جس سے میرے دل کو بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اگر ان سفارشات پر عمل کیا گیا تو عرب اور مسلمانانِ عالم خاموش نہیں بیٹھیں گے۔"

8 مئی 1946ء کو مصر سے برطانوی فوج کے انخلاء پر شاہ فاروق اور اہلِ مصر کو مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا: "برطانیہ کو ابھی دو کام اور کرنے ہیں۔ ایک اعرابِ فلسطین کے قومی مطالبے کو پورا کرنا ہے اور دوسرے ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان دینا ہے۔"

30 جون 1946ء کو قائداعظم نے فرمایا: "میں برطانیہ اور امریکہ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ فلسطین کو اس کی حالت پر چھوڑ دیں اور وہاں یہودیوں کا داخلہ فوراً بند کر دیں، اور ان کو کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ میں آباد کریں۔ جو یہودی فلسطین میں آباد ہیں، ان کو بھی وہاں سے ہٹا دیا جائے یا پھر یہودیوں اور عربوں کو اپنا جھگڑا آپ چکانے دیا جائے۔"

مسلمانانِ ہند کی نمائندہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ، قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مشاہیر خصوصاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی نے بھی خلافت اور فلسطین مسئلے پر سر توڑ کوششیں کیں۔ ایک دفعہ جب ان کی والدہ بی اماں کو یہ بتایا گیا کہ دونوں بھائیوں (علی برادران) نے یہ قبول کر لیا ہے کہ انہوں نے ہی

مسلمانوں کو بغاوت پر ابھارا ہے اور یہ کہ وہ حکومتِ برطانیہ سے معافی مانگنے پر تیار ہیں، تو بی اماں نے بیٹوں کے نام فوراً ایک خط لکھا کہ ابھی میرے بوڑھے ہاتھوں میں اتنی قوت ضرور باقی ہے کہ تم دونوں کا گلا گھونٹ سکوں اور اگر تم نے معافی مانگی تو میں واقعی تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔

اسی زمانے میں سہارن پور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد کی نظم "صدائے خاتون" کے یہ بول پورے ہندوستان کا نعرہ بن گئے:

بولیں اماں محمد علی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کلمہ پڑھ پڑھ کر پھانسی پہ چڑھنا

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بی اماں کا بیٹا، تحریک خلافت کا قائد محمد علی 1930ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گیا۔ وہاں اس نے انگریزوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "میں اب ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ آزاد ہو، مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ ہندوستان کو آزادی نہیں دیں گے تو مجھے یہاں قبر کی جگہ دینی پڑے گی"۔ مولانا کی یہ خواہش پوری ہوئی اور وہ بیت المقدس میں دفن ہیں۔

صرف برعظیم پاک و ہند ہی کے مسلمانوں میں تحریک خلافت اور آزادی جیسی تحریکیں نہیں چل رہی تھیں، بلکہ ہر اسلامی ملک میں، جو اس زمانے میں تاج برطانیہ کے ماتحت تھے، صیہونی سازشوں کے خلاف ایسی ہی تحریکیں زور شور سے جاری تھیں۔ مقامی تحریکوں کے علاوہ تمام اسلامیانِ عالم کو یکجا کرنے کی ایک بڑی تحریک بھی زور پکڑ گئی تھی جو "پان اسلامیت" کی تحریک کہلاتی ہے۔ اس کے قائد اول مولانا جمال الدین افغانی تھے۔ ان کی کوششوں سے ایران، ترکی، مصر، ہند و پاک اور دوسرے اسلامی ممالک میں اسلامی نشاۃ ثانیہ اور احیاء و تجدید کی تحریک نے ایک عالم گیر صورت اختیار کر لی۔ خصوصاً دانشوروں نے مولانا افغانی کی تحریک سے اثر قبول کیا جن میں علامہ اقبال، شیخ محمد عبدہ، اور علی شریعتی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ پان اسلامیت کی تحریک نے بھی صیہونی تحریک کے خلاف ایک بند باندھنے کا شعور دیا۔ اس تحریک کے زیر اثر عربوں کو اپنی تنظیم بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی جو دوسری جنگ عظیم کے اواخر میں "عرب لیگ" کے نام سے قائم ہوئی۔

جون 1967ء میں جب یہودیوں نے مسجد الاقصیٰ کو نذرِ آتش کیا تو پان اسلامیت کی چنگاری جو غفلت کی راکھ میں دبی ہوئی تھی، پھر سے شعلۂ جوالہ بنی اور اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کی شکل میں اسلامی ممالک کا ایک بڑا سیاسی ادارہ بن گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تنظیم نے اب تک کوئی نظر آنے والا کام نہیں کیا، سوائے اس کے کہ اسلامیانِ عالم کے لیے ایک مشترکہ و متحدہ پلیٹ فارم ضرور مہیا کیا ہے، جہاں سے ان کے مفادات کے خلاف ہونے واقعات پر صدائے احتجاج ضرور بلند کی جا سکتی ہے۔

یہود کا ہدف[60]

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ یہود کا ایک دور وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہانوں پر ان کی برتری کا اعلان فرمایا۔ "وانی فضلتکم علی العالمین" کہ اپنے دور میں تمام جہانوں پر اور تمام دنیا پر ان کو برتری حاصل تھی۔ بالاتری بھی حاصل تھی اور فضیلت بھی حاصل تھی۔ اس دور میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت "اسرائیل" کہلاتی تھی، جس کے بارے میں خود حضرت سلیمانؑ نے فرمایا تھا "رب ھب لی ملکاً لاینبغی لاحد من بعدی"۔ اس کا دائرہ ان کے دور میں جو تھا وہ آج کے یہودیوں کے نزدیک گریٹر اسرائیل (عظیم تر اسرائیل) کہلاتا ہے۔ آج کے یہود کا ٹارگٹ اور نظریہ یہ ہے کہ ہم نے حضرت سلیمانؑ کے دور کا اسرائیل واپس لینا ہے، بحال کرنا ہے۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ نیٹ پر موجود ہے۔ ایک سانپ کی شکل میں سرحد کے ساتھ اس علاقے کو گھیرا ہوا ہے جس کو وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں مصر، سوڈان، عراق، اردن اور فلسطین اور سعودیہ آدھا شامل ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سے وہ سرحد گزرتی ہے۔ مدینہ پر ان کا دعویٰ ہے، جبکہ مکہ ان کے دعوے سے خارج ہے۔

---

[60] http://zahidrashdi.org/3438

یہود کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ سے نکالا تھا۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، تینوں قبیلوں کو۔ اور خیبر میں ہماری حکومت تھی، مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے ہمیں وہاں سے نکالا۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کا خیبر پر قبضہ ہوا اور اس وقت یہودیوں نے مزارع کے طور پر خیبر میں رہنے کی اجازت مانگی، حضورؐ نے اجازت دے دی، پھر حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں انہیں خیبر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہود کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ اور خیبر سے نکالا تھا اس لیے خیبر بھی ہمارا حصہ ہے اور مدینہ بھی ہمارا حصہ ہے۔ چنانچہ گریٹر اسرائیل کے نقشے میں مدینہ منورہ اور خیبر شامل ہیں۔ اور یہ ان کا اصل ٹارگٹ ہے کہ ہم نے قدیمی اسرائیل بحال کرنا ہے۔

ہیکلِ سلیمانی کی تاریخ اور اس کی تیسری مرتبہ اندرونی تعمیر کی تیاری

ہیکلِ سلیمانی درحقیقت ایک مسجد یا عبادت گاہ تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے جنات سے تعمیر کروائی تھی تاکہ لوگ اس کی طرف منہ کر کے یا اس کے اندر عبادت کریں۔ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر سے پہلے یہودیوں کے ہاں کسی بھی باقاعدہ ہیکل کا نہ کوئی وجود اور نہ اس کا کوئی تصور تھا۔ اس قوم کی بدوؤں والی خانہ بدوش زندگی تھی۔ ان کا ہیکل یا معبد ایک خیمہ تھا۔ اس خیمے میں تابوت سکینہ رکھا ہوتا تھا۔ جس کی جانب یہ رخ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ روایات کے مطابق یہ تابوت جس لکڑی سے تیار کیا گیا تھا اسے "شمشاد" کہتے ہیں۔ جسے جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا تھا۔ یہ تابوت نسل در نسل انبیاء سے ہوتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا تھا، اس مقدس صندوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، من و سلویٰ، اور دیگر انبیاء کی یادگاریں تھیں۔ یہودی اس تابوت کی برکت سے ہر مصیبت و پریشانی کا حل نکال لیا کرتے تھے۔ مختلف اقوام کے ساتھ جنگوں کے دوران اس صندوق کو لشکر کے آگے رکھا کرتے، اس کی برکت سے دشمن پر فتح پایا کرتے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہت عطا ہوئی تو آپ نے اپنے لئے ایک باقاعدہ محل تعمیر کروایا۔

ایک دن ان کے ذہن میں خیال آیا کہ میں خود تو محل میں رہتا ہوں جبکہ میری قوم کا معبد آج بھی خیمے میں رکھا ہوتا ہے۔ یہ بائیبل کی روایات ہے۔ جیسے بائیبل میں ہے؛ "بادشاہ نے کہا: 'میں تو دیودار کی شان دار لکڑی سے بنے ہوئے ایک محل میں رہتا ہوں، مگر خداوند کا تابوت ایک خیمے میں پڑا ہوا ہے۔ (2۔ سموئیل 4؛2)

چنانچہ آپ نے ہیکل کی تعمیر کا ارادہ کیا اور اس کے لئے ایک جگہ کا تعین کیا گیا۔ ماہرین نے آپ کو مشورہ دیا کہ اس ہیکل کی تعمیر آپ کے دور میں ناممکن ہے۔ آپ اس کا ذمہ اپنے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دے دیجیئے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے (۹۷۰ق م تا ۹۳۰ق م) اپنے دورِ حکومت کے چوتھے سال میں اس کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آج اس کی بناوٹ اور مضبوطی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تعمیر انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اتنے بھاری اور بڑے پتھروں کو ان جنات کی طاقت سے چنا گیا تھا، جن پر حضرت سلیمانؑ کی حکومت تھی۔

ہیکل کی پہلی تعمیر کے دوران ہی حضرت سلیمانؑ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن جنات کو پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے ہیکل کی تعمیر مکمل کر دی۔ یہ واقعہ آپ نے پہلے بھی پڑھا ہو گا کہ حضرت سلیمانؑ کی روح اللہ نے دورانِ عبادت ہی قبض کر لی، لیکن اس کی ترکیب اس طرح بنی کے آپ ایک لکڑی پر سر اور کمر رکھ کر عبادت میں مصروف ہو گئے اور اس لکڑی کے سہارے سے یوں لگتا تھا کہ آپ اب بھی عبادت ہی کر رہے ہیں۔ جبکہ آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہر حال یہ ہیکل، معبد یا مسجد بہت عالیشان اور وسیع و عریض تعمیر کی گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد اس میں تین حصے کر دیئے گئے تھے۔ بیرونی حصے میں عام لوگ عبادت کیا کرتے۔ اس سے اگلے حصے میں علماء جو کہ انبیاء کی اولاد میں سے ہوتے، ان کی عبادت کی جگہ تھی۔ اس سے اگلے حصے میں جسے انتہائی مقدس سمجھا جاتا تھا، اس میں تابوت سکینہ رکھا گیا تھا۔ اس حصے میں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی، سوائے سب سے بڑے عالم پیش امام کے۔ وقت گزرتا رہا، اس دوران بنی اسرائیل میں پیغمبر معبوث ہوتے رہے۔ یہ قوم بد سے بدتر ہوتی رہی۔ یہ کسی بھی طرح اپنے گناہوں سے توبہ تائب ہونے یا ان کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ ایک جانب عبادتیں کیا کرتے دوسری جانب اللہ کے احکام کی صریح خلاف ورزی بھی کرتے رہے۔ ان کی اس دوغلی روش سے اللہ پاک ناراض ہو گیا۔ ان کے پاس ایک بہت بڑی تعداد میں انبیاء بھی بھیجے گئے لیکن یہ قوم سدھرنے کو تیار نہ تھی۔ حتیٰ کہ ان کی شکلیں تبدیل کر کے بندر اور سؤر تک بنائی گئیں۔ لیکن یہ گناہوں سے باز نہ آئے۔ تب اللہ نے ان پر لعنت کر دی۔

۵۸۶ ق۔م میں بخت نصر نے ان کے ملک پر حملہ کیا، ان کا ہیکل مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ ہیکل میں سے تابوت سکینہ نکالا، چھ لاکھ کے قریب یہودیوں کو قتل کیا۔ تقریباً دو لاکھ یہودیوں کو قید کیا اور اپنے ساتھ بابل (عراق) لے گیا اور شہر سے باہر یہودی غلاموں کی ایک بستی تعمیر کی، جس کا نام تل ابیب رکھا گیا۔ ۷۰ سال تک ہیکل صفحۂ ہستی سے مٹا رہا۔ دوسری طرف بخت نصر نے تابوتِ سکینہ کی شدید بے حرمتی کی اور اسی کہیں پھینک دیا۔

کہا جاتا ہے اس حرکت کا عذاب اسے اس کے ملک کو اس طرح ملا کہ سن ۵۳۹ ق۔م میں ایران کے بادشاہ سائرس نے بابل (عراق) پر حملہ کر دیا اور بابل کے ولی عہد کو شکست فاش دے کر بابلی سلطنت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ سائرس ایک نرم دل اور انصاف پسند حکمران تھا۔ اس نے تل ابیب کے تمام قیدیوں کو آزاد کر کے ان کو واپس یروشلم جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ میں ان کو ہیکل کی نئے سرے سے تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ ساتھ میں اس کی تعمیر کے لئے ہر طرح کی مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ چنانچہ ہیکل کی (دوسری) تعمیر ۵۳۷ ق م میں شروع ہوئی۔ لیکن تعمیر کا کام سرانجام دینے والوں کو اپنے ہم وطن دشمنوں کی اتنی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ تعمیراتی کام جلد ہی عملی طور پر بند ہو گیا اور دارا (Darius) اوّل کے دورِ حکومت تک مداخلت ہی کا شکار رہا۔ اُس کی حکمرانی کے دوسرے سال میں حضرت ذکریا علیہ السلام نے وہاں کے گورنر زرو بابل اور سردار کاہن یوشواہ (یوشع) کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہیکل کی تعمیر ثانی کی دوبارہ کوشش کریں۔ انھوں نے مثبت ردِ عمل کا اظہار کیا اور پوری قوم کی پرجوش تائید اور ایرانی حکام اور بذات خود بادشاہ کی آشیر باد سے ہیکل ثانی اپنی اضافی تعمیرات سمیت ساڑھے چار سال کے عرصے میں ۵۲۰ تا ۵۱۵ ق م پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ لیکن اس بار اس میں تابوتِ سکینہ نہیں مل سکا۔ اس کے بارے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ بخت نصر نے اس کا کیا کیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس مقدس صندوق کی مزید توہین سے بچانے کے لئے اسے اللہ پاک کے حکم سے کسی محفوظ مقام پر معجزانہ طور پر چھپا دیا گیا۔ جس کا کسی انسان کو علم نہیں۔ لیکن یہودی اس کی تلاش میں پورے کرۂ ارض کو کھود ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات، عام طور پر تاریخ دان ہیکل کی دو دفعہ تعمیر اور دو دفعہ تباہی کا ذکر کرتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے ایک بات سامنے آئی ہے کہ ایسا نہیں، اس ہیکل کو تین بار تعمیر کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ بھی ایک دلچسپ کہانی وجود میں آئی۔ ہیروڈس بادشاہ جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چند سال پہلے کا بادشاہ ہے اس نے جب اس کی بہتر طریقے سے تعمیر کی نیت کی تو یہودیوں کے دل میں ایک خوف پیدا ہوا کہ اگر اسے نئے سرے سے تعمیر کے لئے گرایا گیا تو دوبارہ تعمیر نہیں ہو گا۔ ہیروڈس نے ان کو بہلانے کے لئے کہا کہ وہ صرف اس کی مرمت کرانا چاہتا ہے، اسے گرانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ ۱۹ ق م میں اس نے ہیکل کے ایک طرف کے حصے کو گرا کر اسے تبدیلی کے ساتھ اور کچھ وسیع کر کے تعمیر کروایا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور یوں یہودیوں کی عبادت میں خلل ڈالے بغیر تھوڑا تھوڑا کر کے ہیکل گرایا جاتا اور اس کی جگہ نیا اور پہلے سے مختلف ہیکل وجود میں آتا رہا۔ یہ کام اٹھارہ ماہ میں مکمل ہوا اور یوں تیسری بار ہیروڈس کے ذریعے ایک نیا ہیکل وجود میں آ گیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا، اللہ کے اس رسول پر ایک بار پھر یہودیوں نے حسبِ معمول مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ دراصل وہ اپنے مسیحا کے منتظر تھے جو دوبارہ آ کر ان کو پہلے جیسی شان و شوکت عطا کرتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا واقعہ پیش آیا۔ آپ کے مصلوب ہونے کے ۷۰ سال بعد ایک بار پھر یہودیوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ اس بار اس عذاب کا نام ٹائٹس تھا۔ یہ رومی جرنیل، بابل کے بادشاہ بخت نصر سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوا۔ اس نے ایک دن میں لاکھوں یہودیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اس نے ہیروڈس کے بنائے ہوئے عظیم الشان ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور یہودیوں کو ہمیشہ کے لئے یروشلم سے نکال باہر کیا۔ یہودی پوری دنیا میں بکھر کر اور رسوا ہو کر رہ گئے۔ کم و بیش اٹھارہ انیس سو سال تک بھٹکنے کے بعد برطانیہ نے جب فلسطین پر قبضہ کیا تو ساتھ ہی ایک ناجائز بچے اسرائیل کو فلسطین میں جنم دے دیا اور یوں صدیوں سے دھکے کھانے والی قوم کو ایک بار پھر اس ملک اسرائیل میں اکٹھے ہونے رہنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن یہ قوم اپنی ہزاروں سال پرانی گندی فطرت سے باز نہ آئی۔ یہ برطانیہ کے جنم دیئے ہوئے اسرائیل تک محدود نہ رہے۔ ایک بار پھر ہمسایہ ممالک کے لئے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مصیبت بننے لگے۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کو اس نے شام کی گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۶۸ء میں اردن کے مغربی کنارے پر قابض ہو گئے۔ اسی سال مصر کے علاقے پر بھی کنٹرول کر لیا۔ آج اس قوم کی شرارتیں اور پھرتیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آج سے دو تین ہزار سال پہلے بھی کس قدر سازشی رہے ہوں گے۔ جس کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کر دی تھی۔

مسلمان ممالک کی ناسمجھی اور بزدلی کی وجہ سے اب اس نے پوری دنیا کے مسلمان ممالک میں آگ لگا کر رکھ دی ہے۔ اب ان کا اگلا مشن جلد از جلد اسی ہیکل کی تعمیر ہے اور اس ہیکل میں تخت داؤد اور تابوت سکینہ کو دوبارہ رکھنا ہے۔ تاکہ ایک بار پھر یہ اپنے مسایا (یہودی زبان کا لفظ) مسیحا کے آنے پر پوری دنیا پر اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ وہ یہ کام انتہائی تیز رفتاری سے کر رہے ہیں۔ اس ہیکل کی تعمیر کے نتیجے میں یہ پوری دنیا جنگ کی آگ میں لپٹ جائے گی۔ امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا اسرائیل کے دارالخلافہ کی تبدیلی کا اعلان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن مسلمان اقوام کو کوئی پرواہ نہیں۔

فلسطین سے محبت کی وجہ

امت مسلمہ اور اہل پاکستان کی فلسطین سے محبت کی وجوہات درج ذیل ہیں:

1. یہ فلسطین انبیاء علیہم السلام کا مسکن اور سرزمین رہی ہے۔
2. حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی۔
3. اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو اس عذاب سے نجات دی جو ان کی قوم پر اسی جگہ نازل ہوا تھا۔
4. حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی سرزمین پر سکونت رکھی اور یہیں اپنا ایک محراب بھی تعمیر فرمایا۔
5. حضرت سلیمان علیہ اسی ملک میں بیٹھ کر ساری دنیا پر حکومت فرمایا کرتے تھے۔
6. چیونٹی کا وہ مشہور قصہ جس میں ایک چیونٹی نے اپنی باقی ساتھیوں سے کہا تھا "اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ" یہیں اس ملک میں واقع عسقلان شہر کی ایک وادی میں پیش آیا تھا جس کا نام بعد میں "وادی النمل-چیونٹیوں کی وادی" رکھ دیا گیا تھا۔
7. حضرت زکریا علیہ السلام کا محراب بھی اسی شہر میں ہے۔
8. حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی ملک کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ اس مقدس شہر میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے اس شہر کو مقدس اس شہر کے شرک سے پاک ہونے اور انبیاء علیہم السلام کا مسکن ہونے کی وجہ سے کہا تھا۔
9. اس شہر میں کئی معجزات وقوع پذیر ہوئے جن میں ایک کنواری بی بی حضرت مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت مبارکہ بھی ہے۔
10. حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے قتل کرنا چاہا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اسی شہر سے آسمان پر اُٹھا لیا تھا۔
11. ولادت کے بعد جب عورت اپنی جسمانی کمزوری کی انتہاء پر ہوتی ہے ایسی حالت میں بی بی مریم کا کھجور کے تنے کو ہلا دینا بھی ایک معجزہ الٰہی ہے۔
12. قیامت کی علامات میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر واپس تشریف اسی شہر کے مقام سفید مینار کے پاس ہو گا۔
13. اسی شہر کے ہی مقام باب لُد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح دجال کو قتل کریں گے۔
14. فلسطین ہی ارض محشر ہے۔
15. اسی شہر سے ہی یاجوج وماجوج کا زمین میں قتال اور فساد کا کام شروع ہو گا۔
16. اس شہر میں وقوع پذیر ہونے والے قصوں میں سے ایک قصہ طالوت اور جالوت کا بھی ہے۔
17. فلسطین کو نماز کی فرضیت کے بعد مسلمانوں کا قبلہ اول ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ہجرت کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام دوران نماز ہی حکم ربی سے آقا علیہ السلام کو مسجد اقصیٰ (فلسطین) سے بیت اللہ کعبہ مشرفہ (مکہ مکرمہ) کی طرف رخ کرا گئے تھے۔ جس مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا وہ مسجد آج بھی مسجد قبلتین کہلاتی ہے۔
18. حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات آسمان پر لے جانے سے پہلے مکہ مکرمہ سے یہاں بیت المقدس (فلسطین) لائے گئے۔
19. سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی اقتداء میں انبیاء علیہم السلام نے یہاں نماز ادا فرمائی۔ اس طرح فلسطین ایک بار پھر سارے انبیاء کا مسکن بن گیا۔

20. سیدنا ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ زمین پر سب سے پہلی مسجد کونسی بنائی گئی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ)۔ میں نے عرض کیا کہ پھر کونسی؟ (مسجد بنائی گئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد الاقصیٰ (یعنی بیت المقدس)۔ میں نے پھر عرض کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چالیس برس کا اور تو جہاں بھی نماز کا وقت پالے، وہیں نماز ادا کرلے پس وہ مسجد ہی ہے۔

21. وصال حبیبنا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ارتداد کے فتنہ اور دیگر کئی مشاکل سے نمٹنے کیلئے عسکری اور افرادی قوت کی اشد ضرورت کے باوجود بھی ارض شام (فلسطین) کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیار کردہ لشکر بھیجنا بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔

22. اسلام کے سنہری دور فاروقی میں دنیا بھر کی فتوحات کو چھوڑ کر محض فلسطین کی فتح کیلئے خود سیدنا عمر کا چل کر جانا اور یہاں پر جا کر نماز ادا کرنا اس شہر کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔

23. دوسری بار بعینہ معراج کی رات بروز جمعہ 27 رجب 583 ھجری کو صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اس شہر کا دوبارہ فتح ہونا بھی ایک نشانی ہے۔

24. بیت المقدس کا نام قدس قران سے پہلے تک ہوا کرتا تھا، قرآن نازل ہوا تو اس کا نام مسجد اقصیٰ رکھ گیا۔ قدس اس شہر کی اس تقدیس کی وجہ سے ہے جو اسے دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس شہر کے حصول اور اسے رومیوں کے جبر و استبداد سے بچانے کیلئے 5000 سے زیادہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جام شہادت نوش کیا۔ اور شہادت کا باب آج تک بند نہیں ہوا، سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔ یہ شہر اس طرح شہیدوں کا شہر ہے۔

25. مسجد اقصیٰ اور بلاد شام کی اہمیت بالکل حرمین الشریفین جیسی ہی ہے۔ جب قران پاک کی یہ آیت (والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الأمین) نازل ہوئی تو ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم نے بلاد شام کو "التین" انجیر سے، بلاد فلسطین کو "الزیتون" زیتون سے اور الطور سینین کو مصر کے پہاڑ کوہ طور جس پر جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ پاک سے کلام کیا کرتے تھے سے استدلال کیا۔

26. قران پاک کی یہ آیت مبارک (ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر أن الأرض یرثھا عبادی الصالحون) سے یہ استدلال لیا گیا کہ امت محمد حقیقت میں اس مقدس سرزمین کی وارث ہے۔

27. یہاں پر پڑھی جانے والی ہر نماز کا اجر 500 گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے۔

فرہنگِ اصطلاحات

آباد کار بستیاں:

ان کو انگریزی میں Settlements کہا جاتا ہے، مگر ان کا مقامی عبرانی نام Kibbutz بھی بین الاقوامی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چھ روزہ جنگ (۱۹۶۷ء) کے دوران میں اسرائیل نے غزوہ پٹی اور مغربی کنارے کے علاقوں پر فوجی قبضہ کر لیا۔ اسرائیلی ان علاقوں کو جوڈیا (Judea) اور سامریہ (Samaria) کے قدیم ناموں سے منسوب کرتے ہیں۔ اس قبضے کے بعد سے تقریباً دو لاکھ یہودی ان علاقوں میں آباد ہونے لگے اور قلعہ بند بستیاں بسا کر ان میں رہائش اختیار کی۔ بہت سے یہودی جن میں عقیدے کے پابند اور سیکولر دونوں طرح کے افراد شامل ہیں، ان علاقوں کو اسرائیل کی قدیم موروثی زمین کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ان بستیوں کے بڑے اہتمام اور زر کثیر سے تعمیر کیا گیا ہے اور ان میں دوسرے ملکوں سے یہودیوں کو لا کر آباد کیا گیا ہے۔

آئی ڈی ایف:

یہ انگریزی میں "اسرائیلی ڈیفنس فورسز" (اسرائیلی دفاعی افواج) مخفف ہے۔ یہ عام طور پر اسرائیل کی برّی افواج کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر واضح رہے کہ اسرائیل میں بری، بحری اور فضائی افواج کی مشترکہ کمان ہے۔

اربد:

اسے اربل بھی کہتے ہیں۔ یہ خطیرہ کا ایک نواحی قصبہ ہے یہاں حضرت یعقوبؑ کے چار بیٹے اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ مدفون ہیں۔

اریحا (Jericho):

بیت المقدس سے بارہ میل مشرق میں ایک مقام اس کے قریب ایک غار ہے جہاں حضرت مریمؑ نے پناہ لی تھی۔ اسی غار میں حضرت مریمؑ کی والدہ اور یوسف نجار کے مزار ہیں۔ اسی جگہ حضرت عیسیٰؑ کو قید رکھا گیا۔

اسرائیلی عرب:

اسرائیل کے حکام "اسرائیلی عرب" کے نام سے ان تقریباً دس لاکھ عرب نژاد افراد کو پکارتے ہیں جو اسرائیلی ریاست کے باضابطہ شہری ہیں۔ یہ افراد خود اس اصطلاح کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی بجائے اپنے آپ کو "اسرائیل میں رہنے والے فلسطینی" کہلوانا چاہتے ہیں۔

اعلان بالفور:

یہ اعلان برطانیہ کے سیاست دان اور وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور (متوفی 1930ء) کے نام سے منسوب ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران یہودی سرمایہ داروں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے وعدہ کر لیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہودیوں کے لیے فلسطین میں "قومی وطن" کے قیام کی حمایت کی جائے گی۔ چنانچہ وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے اس وعدے کی یقین دہانی 2 نومبر 1917ء کو یہودیوں کے سرکردہ رہنما لارڈ راتھس چائلڈ کے نام اپنے مکتوب میں کرائی، جس کا متن یہ تھا: "ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی ہے اور اپنی بہترین کوششیں اس مقصد کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے صرف کرے گی، لیکن یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جس سے فلسطین میں موجود غیر یہودی آبادی (یعنی مسلم اور مسیحی عربوں) کے شہری یا مذہبی حقوق معرضِ خطر میں پڑیں یا یہودیوں کو دوسرے ملکوں میں جو سیاسی حیثیت اور حقوق حاصل ہیں، ان کو ضرر پہنچے"۔ یہ اعلان صہیونی سیاست میں بنیادی حیثیت حاصل کر گیا، اور قضیۂ فلسطین کی اصل جڑ بن گیا۔

الخلیل:

یہ جبرون کا جدید عربی نام ہے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نام پر تبدیل کیا گیا ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے خاندانی قبرستان کی حیثیت سے آیا ہے۔ یروشلم سے پہلے حضرت داؤدؑ کا دارالحکومت یہیں تھا۔ ہر فلسطینی جنگ (مکابی، رومی اور صلیبی) میں یہ مقام نمایاں رہا ہے۔ اسی شہر کی جامع مسجد میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی قبریں ہیں۔ مسجد کی چار دیواری کے باہر حضرت یوسفؑ کا مقبرہ ہے۔ یہودیوں نے 1967ء کی چھ روزہ جنگ کے بعد سے حرم خلیل کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس شہر کی آبادی 60 ہزار سے زیادہ ہے اور یہ بیت المقدس سے چند میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے۔

النکبہ:

رنج و غم اور ذلت خواری کے معنی میں "نکبت" اردو لغت میں بھی مستعمل ہے۔ جب 14 مئی 1948ء کو اسرائیل نے اپنی آزادی کا یک طرفہ اعلان کر دیا تھا جس کے بعد فلسطینی قوم کی غارت گری اور بے دخلی کا عمل شدت اختیار کر گیا۔ اہلِ فلسطین ہر سال 14 مئی کو یوم النکبہ (تباہی و بربادی کا دن) کے طور پر مناتے ہیں اور مظاہروں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں غم کے ساتھ غصہ بھی شامل ہوتا ہے۔

انتداب (Mandate):

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانیہ نے مکر و فریب سے فلسطینیوں کو ترکوں کے خلاف اپنے ساتھ ملالیا اور ان سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد ان کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ ایسا ہی وعدہ انہوں نے "اعلانِ بالفور" کی صورت میں یہودیوں سے کیا تھا۔ 1918ء میں "لیگ آف نیشنز" نے فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب (حکم داری) کر دیا۔ برطانیہ کو انتدابی ذمہ داریاں تفویض کرتے وقت جو حکم جاری کیا گیا اس میں اعلان بالفور بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ گویا یہودیوں کی قومی ریاست قائم کرنے کا ضمانت نامہ تھا۔ برطانیہ نے سر رابرٹ سیموئیل کو فلسطین کا پہلا ہائی کمیشنر مقرر کیا جو خود کٹر یہودی تھا اور صہیونیت کا علم بردار۔

انتفاضہ:

اسے انگریزی سے ترجمہ کرتے ہوئے بعض اوقات "انتفادہ" بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ "نفض" سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں جھاڑنا۔ اسے شورش اور بغاوت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح پہلے پہل اس وقت سامنے آئی جب 1987ء کے اواخر میں اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں خون الود جھڑپیں شروع ہو گئیں اور تقریباً چھ برس تک جاری رہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انتفاضہ کی وجہ سے اسرائیلی حکام کو قبضہ و تسلط کی حکمتِ عملی پر از سر نو غور کرنا پڑا اور وہ یاسر عرفات کی "تنظیم آزادئ فلسطین" سے مذاکرات کے لیے مجبور ہوئے۔

اوسلو معاہدہ:

اس معاہدے کا وہ بنیادی خاکہ جو اسرائیل اور تنظیم آزادئ فلسطین (پی ایل او) کے درمیان ناروے کے شہر اوسلو میں خفیہ مذاکرات کے نتیجے میں طے پایا، یہ معاہدہ اس وقت تاریخی حیثیت اختیار کر گیا جب امریکا میں وائٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر ستمبر 1993ء میں یاسر عرفات اور اسرائیل کے اس وقت کے وزیر اعظم رابن نے مصافحہ کیا۔

بیت اللحم:

بیت المقدس سے چھ میل جنوب میں حضرت مسیحؑ کی ولادت گاہ، یہاں حضرت داؤدؑ کا مزار بھی ہے۔ بیت المقدس سے بیت اللحم آئیں تو نصف راستہ طے کرنے پر حضرت یوسفؑ اور بنیامین کی والدہ یعنی حضرت یعقوبؑ کی دوسری اہلیہ راحیل کا خوبصورت مقبرہ نظر آتا ہے۔ یہاں حضرت عمر فاروقؓ تشریف لائے تھے اور ایک جگہ نماز ادا کر کے اسے مسجد کی حیثیت دی جس پر بعد میں مسلمانوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی جو مسجد عمرؓ کہلاتی ہے۔

بیت المقدس:

اسے یروشلم بھی کہتے ہیں۔ امت مسلمہ کا قبلۂ اول، یروشلم اور اس کی عبادت گاہ کی بنیاد حضرت داؤدؑ نے رکھی اور تکمیل حضرت سلیمانؑ نے کی۔ یہ ان شہروں میں سے ایک ہے جنہیں نوعِ انسانی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے، جس کا ذرہ ذرہ مقدس ہے۔ اکثر انبیائے کرام اسی شہر میں مبعوث ہوئے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں مقدس ہے۔ پیغمبر آخر الزماں ﷺ ہجرت کے بعد صحابہ کرام کے ساتھ سترہ ماہ تک بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ جب حضور ﷺ معراج کے لیے گئے تو یہی مقام آپ ﷺ کی پہلی منزل بنا۔ اس مقام پر آپ ﷺ نے انبیائے سابق کی امامت کرائی۔ یہاں حضرت سلیمانؑ اور کئی دوسرے انبیاء کے مقابر ہیں۔ اس پر فی الحال یہودیوں کا تسلط ہے۔ جبکہ یاسر عرفات کا مطالبہ ہے کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی پہلی شرط یہ ہے کہ پورا بیت المقدس (یروشلم) اس ریاست کا دارالحکومت ہو گا، جو یہود کو کسی قیمت پر منظور نہیں۔ اس میں مشرقی یروشلم خاص اہمیت کا حامل ہے جہاں Old City موجود ہے۔ تقریباً تمام مقدس مقامات مشرقی یروشلم میں ہیں۔ 1948ء سے 1967ء تک اردن کے پاس تھا 1967ء کے بعد اسرائیل نے ہر۔۔۔ قبضہ کر لیا۔ آج یہ Occupied Terrorism ہے۔

تنظیم آزادئ فلسطین (پی ایل او):

فلسطین کی آزادی کی سیاسی تنظیم اکتوبر 1974ء میں رباط میں منعقدہ عربوں کی کانفرنس میں اس تنظیم کو متفقہ طور پر فلسطینی باشندوں کی واحد نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ 22 نومبر 1974ء کو اس کے سربراہ یاسر عرفات نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ دریں اثناء دنیا کے 70 ممالک نے اسے تسلیم کر لیا۔ 1976ء میں اسے عرب لیگ نے پورے رکن کی حیثیت دی۔ 6 جون 1982ء کو لبنان پر اسرائیلی حملے سے اس تنظیم کو بڑا دھچکا لگا۔ اسرائیلی فوج کی زبردست گولہ باری نے پی ایل او کے سات ہزار سے زیادہ مجاہدین کو لبنان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے شام، اردن اور عراق میں پناہ لی۔ یاسر عرفات ایک ہزار افراد کی معیت میں شام پہنچے۔ پھر انہوں نے تیونس میں اپنا صدر دفتر قائم کر لیا۔ اس کے سربراہ یاسر عرفات ہیں جن کا گروپ "الفتح" اس تنظیم میں شامل سب سے بڑا دھڑا ہے۔ الفتح کے اندر بھی مختلف چھوٹے چھوٹے گروپ ہیں جن میں سے تازہ ترین کا نام "تنظیم" ہے اور یہ نیم خود مختار ادارہ گلیوں اور سڑکوں میں لڑنے والے (سٹریٹ فائٹرز) نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ 29 اکتوبر 2004ء کو محمود عباسی اس کے چیئرمین نامزد ہوئے اور اب تک ہیں۔

ٹمپل ماؤنٹ:

یہ یروشلم کے معبد ثانی (سیکنڈ ٹمپل) کے لیے اسرائیلی نام ہے جو اہلِ یہود کے لیے متبرک ترین مقام ہے۔ اب اس کی صرف مغربی دیوار، جو "دیوار گریہ" کے نام سے معروف ہے، باقی رہ گئی ہے، اور یہ مقام اب پوری طرح اس مسجد کے زیر سایہ آ گیا جسے عرب مسلمان حرم شریف کہتے ہیں۔ اس مقام پر یہودیوں کی تعمیر کردہ دوسری عبادت گاہ (ہیکل سلیمان کی تعمیر نو) کو رومی افواج نے پہلی صدی عیسوی میں تباہ کر ڈالا تھا۔

جنگ رمضان:

اسے مسلمان جنگ رمضان کہتے ہیں، کیونکہ یہ رمضان شریف میں لڑی گئی تھی، اور یہودی اسے جنگِ کپور کہتے ہیں، کیونکہ اس کا آغاز یوم کپور پر ہوا تھا۔ یوم کپور عبرانی زبان میں یوم کفارہ کا نام ہے جو یہودیوں کا سب سے مقدس دن ہے اور بڑے اہتمام اور رسوم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ 1973ء میں یوم کپور کے موقع پر مصر اور شام نے اسرائیل کے خلاف مشترکہ طور پر اچانک کاروائی کی۔ ابتدا میں ہزیمت اٹھانے کے بعد اسرائیلی فوج نے پے در پے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں اور عربوں کے اس پرانے خواب کو حقیقت کا روپ دھارنے سے روک دیا کہ اسرائیل کو طاقت کے استعمال سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

چھ روزہ جنگ:

جون 1967ء میں اسرائیل نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان عرب افواج کے خلاف پیش دستی کی جو اس کی سرحدوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ چھ روز کے اندر اندر اسرائیل کی مسلح افواج کے اردن کے قبضے سے یروشلم اور مغربی کنارہ، شام سے جولان کی پہاڑیاں اور مصر سے غزہ کی پٹی اور صحرائے سینا چھین کر ان پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔ اس جنگ میں

چھینے ہوئے علاقوں میں سے صرف صحرائے سینا1978ء کے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد مصر کو واپس کر دیا گیا۔ یہ چھ روزہ جنگ عرب دنیا میں "جون کی جنگ" کے نام سے معروف ہے اور عرب دانش وروں میں شدید اخلاقی وشناختی بحران کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

حطین:

یہ وہی گاؤں ہے جس کے مشہور معرکے 1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو ختم کر دیا تھا۔ سلطان نے یہاں ایک قطعۂ اراضی پر اپنی تاریخی فتح کی یاد میں "قبۃ النصر" کے نام سے ایک یادگار برج تعمیر کیا تھا۔ اس کے قریب ایک گاؤں خیارہ میں حضرت شعیبؑ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

حرم الشریف:

وہ مقدس مقامات جن کی بدولت بیت المقدس کا شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدتوں کا مرکز ہے، ان میں سے اکثر وبیشتر شہر کی مشرقی پہاڑی موریہ پر ایک بڑے احاطے میں ہیں، جسے اہلِ اسلام حرم الشریف کے نام سے پکارتے ہیں جو بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی اسی حرم میں ہیں۔ حرم الشریف میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جن کو مسلمان "محراب" کہتے ہیں انہیں مقدس سمجھتے اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔ بعض تاریخ دانوں کی رائے میں حرم الشریف اور ٹیمپل ماؤنٹ ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ واللہ اعلم

حماس:

یہ ان مسلح اور فوجی انداز کے اسلامی گروپوں میں سب سے بڑا ہے جو اسرائیلی ریاست کو نیست ونابود کر کے فلسطین میں اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

حیفہ:

فلسطین کا شہر جس کی آبادی دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ جبل کرمل یہیں واقع ہے اس کے نواح میں پٹرول کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ عراق سے تیل کی جو پائپ لائن آتی ہے اس کا آخری مقام حیفہ ہے۔

دیر یاسین:

ایک گاؤں جو اس علاقے کی بیرونی حدود میں واقع تھا جسے اقوام متحدہ نے مستقبل کی یہودی ریاست میں شامل کرنا تجویز کیا تھا۔ یہ تل ابیب اور بیت المقدس کی درمیانی گزرگاہ میں بلندی پر واقع تھا۔ اس گاؤں میں سات سو پچاس فلسطینی آباد تھے۔ اس میں یہودی گوریلا دستوں کے ہاتھوں فلسطینی باشندوں کا قتل عام ایک ناقابلِ فراموش اور تکلیف دہ یاد ہے۔ اس گاؤں کی تباہی بیسویں صدی کی یہودی فلسطینی تاریخ کا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ سفاکانہ بے رحمی کا یہ ہولناک مظاہرہ اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا، بلکہ حقیقت میں یہ ایک پیشگی انتباہ تھا، چار سو عرب دیہات اور شہروں کو منظم انداز میں غیر آباد کرنے اور وہاں سے سات لاکھ سے زیادہ فلسطینیوں کے اخراج اور دنیا کے دوسرے خطوں میں آباد دیگر یہودیوں کو یہاں لا کر فلسطینیوں کی جگہ آباد کیا جاسکے۔

دیوار گریہ:

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کے باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مقام پر آتے اور گریہ وبکا کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس کا نام دیوارِ گریہ پڑ گیا ہے۔ مسلمان اس کو "البراق" کہتے ہیں کیونکہ شبِ معراج رسول کریم ﷺ اسی جگہ براق سے اترے اور براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اکثر ماہرین آثار قدیمہ کی رائے میں موجودہ دیوارِ گریہ حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں بلکہ یہ اس عمارت کے باقی ماندہ آثار ہیں جسے ہیرود نے تعمیر کرایا اور ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے یروشلم کے ساتھ ہی پیوندِ زمین کر دیا تھا۔

رملہ(Ramallah):

القدس کے مغرب میں یعنی مغربی کنارے کا ایک اہم قصبہ جہاں یاسر عرفات نے آزاد فلسطین قائم ہونے تک اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے۔ "رام اللہ" القدس کے شمال میں ایک اور شہر ہے جس کا ہندی لفظ "رام" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عربی میں رام کا مطلب قصد کرنا طلب کرنا اور بلندی کے ہیں جبکہ رملہ کے معنی باریک ریت کے ہیں۔

صہیون(Zion):

بیت المقدس کی ایک پہاڑی جس پر حضرت داؤدؑ نے یروشلم فتح کرنے کے بعد "جشنِ فتح" منایا تھا۔ چنانچہ یہودی اسی نسبت سے صہیون کو مقدس سمجھتے ہیں اور یروشلم کو "دختر صہیون" کہتے ہیں۔ اسی سے صہیونیت کی تحریک چلی ہے جس کا مقصد کھوئی ہوئی ریاست صیہون ویروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کی از سر نو تعمیر ہے۔

غزہ(کی پٹی):

بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع گنجان آبادی والے رقبے کی ایک قاش جو 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے مصر سے چھین لی۔ اب اس علاقے میں تقریباً دس لاکھ سے زیادہ آبادی ہے جس میں کوئی چھ سات ہزار یہودی آبادکار بھی شامل ہیں جو تقریباً 30 فیصد رقبے پر قابض ہیں۔ غزہ وہ ایک شہر ہے جہاں رسول کریم ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم بن عبد مناف کی قبر ہے۔ یہی قصبہ امام محمد ابن ادریس شافعی کی ولادت گاہ ہے۔

قبۃ الصخرہ:

صخرہ کے معنی چٹان کے ہیں۔ یہاں سے رسول کریم ﷺ براق پر سوار ہو کر معراج کی شب آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہاں ایک مسجد تعمیر کیے جانے کا حکم دیا جسے 69 ہجری میں خلیفہ عبدالملک بن مروان نے از سرِ نو تعمیر کرایا اور یہی مسجد اقصیٰ کہلاتی ہے۔

کیمپ ڈیوڈ:

واشنگٹن کے نزدیک یہ امریکی صدر کی سرکاری تفریح آرام گاہ ہے اور اسے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں توجہ اس لیے حاصل ہوئی کہ یہاں مشرق وسطی کے مذاکرات کے کئی دور چلے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور 1978ء کا معاہدہ ہے جو امریکا کے صدر جمی کارٹر نے اسرائیل اور مصر کے درمیان کرایا تھا۔ بعد ازاں کیمپ ڈیوڈ میں وہ ناکام مذاکرات ہوئے جن میں صدر کلنٹن نے اسی سابقہ انداز میں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تصفیہ کرانا چاہا تھا۔

فلسطین قومی اتھارٹی:

فلسطین کی عبوری حکومت جس کے سربراہ یاسر عرفات ہیں۔ حکومتِ اسرائیل لفظ "قومی" کا استعمال نہیں کرتی اس لیے کہ اس نے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کو تسلیم نہیں کیا ہے اس لیے وہ PNA کی بجائے اتھارٹی کو صرف PA کہتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ:

مسلمانوں کا قبلۂ اول بیت المقدس کی ایک تاریخی مسجد یہ مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے بھی مقدس ہے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں بھی آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی"۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھنا چاہیے یعنی مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی"۔

جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے اردن کے حصے کے شہر بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور اس طرح مسلمانوں کا قبلۂ اول بھی اسرائیل کی عمل داری میں چلا گیا۔ اسرائیل کی اس جارحانہ کاروائی کے خلاف دنیائے اسلام اور امن پسند قوموں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن ابھی مسلمانوں کی جانب سے اسرائیل کی مذمت کا سلسلہ جاری تھا کہ 21 اگست 1969ء کو ایک عیسائی باشندے مائیکل روہن نے مسلمانوں کی اس انتہائی مقدس مسجد کو نذرِ آتش کر دیا۔ شمعِ رسالت ﷺ کے پروانوں نے

آگ پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سوچی سمجھی سازش کے تحت فوراً اپنی فوج طلب کرلی۔ اسرائیلی فوج نے یہاں پہنچتے ہی تین تین سوفٹ بلند شعلوں سے لڑنے والے مسمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ مسلمان نوجوانوں نے اپنی جان پر کھیل کر چاندی کے بڑے گنبد کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اگر یہودی درندے مزاحمت نہ کرتے تو تبرکات کو بھی بچالیا جاتا۔ آتش زدگی سے مسجد کے جنوبی حصے کو مکمل طور پر نقصان پہنچا۔ اسرائیلی حکومت مسجد الاقصیٰ کو ہیکل سلیمان میں تبدیل کرنا چاہتی ہے اور اس ضمن میں وہ متعدد بار مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی مرتکب بھی ہوئی ہے۔

مغربی کنارہ:

دریائے اردن کے مغرب میں واقع وہ قطعہ زمین جو اسرائیل نے 1967ء کی جنگ میں اردن سے چھین لیا۔ یہ علاقہ پہلے برطانوی مقبوضہ فلسطین کا حصہ تھا جس کو 1950ء میں اردن اس وقت اپنے زیر نگیں لے آیا تھا جب اسرائیل کے قیام کے اعلان کے بعد چھڑنے والی جنگ میں عرب مشترکہ افواج کا شکست اٹھانا پڑی تھی۔ اب یہ "فلسطینی قومی اتھارٹی" میں شامل ہے۔

مقبوضہ علاقے:

1967ء کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے اردن سے مغربی کنارہ اور مصر سے غزہ پٹی کو چھین کر ان پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران میں مشرقی یروشلم جس میں پرانا شہر بھی شامل ہے اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ برابر کیا جاتا رہا ہے مگر اسرائیل نے ان پر اپنا غیر قانونی اقتدار مستحکم کر رکھا ہے۔

واپسی کا حق:

1948ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد تقریباً چالیس لاکھ فلسطینی اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان پناہ گزینوں اور ان کی آل اولاد کا اپنے اصل گھروں کو واپسی کا حق فلسطینیوں کی طرف سے ایک بنیادی مطالبہ رہا ہے مگر اسرائیل نہ صرف اس حق کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ یہودیوں کو بھی ایک اور طرح کا "واپسی کا حق" دینے پر مصر ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے یہودی آکر فلسطین میں آباد ہو سکتے ہیں گویا اس سرزمین پر واپسی یہود کا موروثی حق ہے۔

اختتامیہ

یہودیت اس وقت تعداد کے لحاظ سے کوئی بڑا مذہب نہیں ہے تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہیں۔ لیکن اثر ورسوخ کے اعتبار سے، عالمی نظام میں مداخلت کے اعتبار سے، میڈیا اور معیشت پر کنٹرول کے حوالے سے یہودی اس وقت طاقتور ترین قوم ہیں۔ یہودیت کو سمجھنا اور پہچاننا ہمارے لیے بہت سے حوالوں سے ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نسلی مذہب ہے، حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں، بنی اسرائیل کہلاتے ہیں، اور نسلی تفاخر کی بنیاد پر اپنے نسلی دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ "نحن ابناء اللہ واحباءہ" جو قرآن کریم نے ان کے بارے میں کہا تھا وہ آج بھی ان کے عقائد اور ان کی نفسیات میں موجود ہے کہ ہم برتر قوم اور برتر نسل ہیں اور ہمیں دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

دوسری طرف عالم اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے واضح پیغام کے باوجود کہ "لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا" بھی عالم اسلام اسرائیل کے حوالے سے دو کیمپوں میں تقسیم ہے۔ ایک کیمپ سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کو ناجائز ریاست سمجھتے ہیں، اور ہمارا موقف یہ ہے کہ فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے۔ یہود نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے، ناجائز قبضہ کیا ہے، دوسری طرف بہت سے مسلم ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی صفوں کا یہ فرق ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے۔

جو مسلمان ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں، وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اسرائیل اس حد تک ایک جائز ریاست ہے جو اقوام متحدہ نے تقسیم کی تھی۔ 1945ء میں اقوام متحدہ نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ یہودی اکثر آبادی پر مشتمل اسرائیل، دوسرا فلسطین، اور تیسرا متنازعہ علاقے کے طور پر اردن کی تحویل میں۔ پھر 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے جو اردن کے حصے پر، شام کی گولان کی پہاڑیوں پر، اور بیت المقدس پر قبضہ کیا ہے، یہ ان ممالک کے ہاں بھی ناجائز قبضہ ہے، وہ اس علاقے کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کوئی واضح قدم نہیں اٹھا پا رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جو ہمیں سمجھنی چاہیے، جب یہ اکٹھے بیٹھتے ہیں تو موقف کے فرق بلکہ تضاد کی وجہ سے کوئی اجتماعی حکمت عملی نہیں طے ہو پاتی اور معاملہ نشستاً، گفتاً و برخواستاً ہو جاتا ہے۔

اب تو عالم یہ ہے کہ تقریباً تمام عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں اور اس کو بطور ریاست تسلیم کر لیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس کا ذکر دور فتن والی احادیث میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین پر ثابت قدم رکھے اور ہمارے حکمرانوں کو غیرت و حمیت دینی عطا فرمائے کہ وہ درست طرز عمل اختیار کرنے والے بن جائیں۔